کچھ دیکھے

کچھ سُنے

نند کشور وکرم

www.taemeernews.com

کچھ دیکھے

کچھ سُنے

www.taemeernews.com

کچھ دیکھے کچھ سُنے

نند کشور وکرم

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی

www.taemeernews.com

Download Link

https://www.taemeernews.com/2019/08/kuch-dekhe-kuch-sune-nand-kishore-vikram-pdf.html

www.taemeernews.com

ISBN 978-81-88298- 19-8

کچھ دیکھے کچھ سنے

قلم کار:
نند کشور وکرم
سال اشاعت
۲۰۱۳ء
قیمت
۲۵۰ روپے
مطبع
سنجیوآفسیٹ کرشن نگر، دہلی۔۱۱۰۰۵۱
ناشر
پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ایف۱۴/۱۲(ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

Kuchh Dekhe, Kuchh Sune

by
Nand Kishore Vikram
Price: Rs. 250/-
Year of publication 2013

PUBLISHERS & ADVERTISERS

F-14/12(D)Krishan Nagar,Delhi-1

www.taemeernews.com

ترتیب

احمد ندیم قاسمی ۹

احمد ندیم قاسمی: ایک ہشت پہلو شخصیت ۱۱

جگن ناتھ آزاد ۱۹

شاعر اور ماہرِ اقبالیات: جگن ناتھ آزاد ۲۱

جمنا داس اختر ۲۷

ہمہ جہت شخصیت: جمنا داس اختر ۲۹

حبیب جالب ۴۱

عوام کا محبوب شاعر: حبیب جالب ۴۳

اُستاد دامن ۵۱

پنجاب کا البیلا شاعر: اُستاد دامنؔ ۵۳

دلیپ سنگھ ۵۷

دلیپ سنگھ: اپنی تحریروں کے آئینے میں ۵۹

دیویندر اسر ۶۵

ایک دانشور کی موت ۶۷

www.taemeernews.com

دیوندر ستیارتھی ۸۵

دیویندر ستیارتھی: ایک قلندر.....ایک ملنگ ۸۷

ساحر ہوشیارپوری ۹۷

ساحر ہوشیار پوری ۹۹

سردار جعفری ۱۰۵

سردار جعفری: ایک مطالعہ ۱۰۷

شباب للت ۱۱۷

شباب للت: ایک شاعر ایک محقق ۱۱۹

شرر فتح پوری ۱۲۷

ہریانہ کا ترقی پسند شاعر: شرر فتح پوری ۱۲۹

شورش کاشمیری ۱۳۷

بیباک اور باضمیر شاعر: شورش کاشمیری ۱۳۹

صابر دت ۱۴۷

صابر دت: چند تاثرات ۱۴۹

قرۃالعین حیدر ۱۵۵

عینی آپا: چند ذاتی تاثرات ۱۵۷

www.taemeernews.com

کیلاش ماہر ۱۶۷

ایک بھولا بسرا شاعر: کیلاش ماہر ۱۶۹

گوپی چند نارنگ ۱۷۷

اُردو کی بین اقوامی شخصیت: گوپی چند نارنگ ۱۷۹

اسرار الحق مجاز ۱۸۵

مجاز کی موت یا خودکشی ۱۸۷

محمد طفیل ۱۹۷

محمد طفیل: ایک مطالعہ ۱۹۹

منیر نیازی ۲۰۷

منیر نیازی اور اُن کی شاعری: ایک سرسری جائزہ ۲۰۹

نارنگ ساقی، کرشن لال ۲۱۵

نارنگ ساقی: ادب دوست اور ادب نواز ۲۱۷

ہنسراج رہبر ۲۲۱

رہبر۔ بے نقاب ۲۲۳

نند کشور وکرم ۲۳۵

بقلم خود ۲۳۷

www.taemeernews.com

احمد ندیم قاسمی

پیدائش: ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء انگہ (ضلع خوشاب، غیر منقسم ہندوستان حال پاکستان)

وفات: ۱۰ جولائی ۲۰۱۰ء (لاہور، پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

احمد ندیم قاسمی

ایک ہشت پہلو شخصیت

۱۰؍جولائی ۲۰۰۶ء کو دنیائے ادب احمد ندیم قاسمی ایسی عظیم المرتبت شخصیت سے محروم ہوگئی جو گزشتہ پون صدی سے اُردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دینے میں منہمک تھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے دور کے ایسے ہشت پہلو ادیب تھے جو اتنے طویل عرصے تک میدانِ ادب میں سرگرم عمل رہے اور ہر صنفِ ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھا کر اتنی غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی ایک ایسے منفرد ادیب تھے جو افسانہ نگار کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے بھی اُردو ادب میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ کہانی کار کی حیثیت سے اُن کے لگ بھگ ڈیڑھ درجن افسانوی مجموعے شائع ہو کر عوام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں 'چوپال'، 'بگولے'، 'طلوع و غروب'، 'سیلاب'،

www.taemeernews.com

گرداب'، 'آنچل'، 'آس پاس'، 'کپاس کے پھول'، 'در ودیوار'، 'سناٹا'، 'بازارِ حیات'، 'برگ حنا'، 'گھر سے گھر تک'، 'نیلا پتھر'، اور 'کوہ پیما' وغیرہ شامل ہیں۔ اور اس میں رتی بھر بھی شک نہیں کہ چوپال سے لے کر کوہ پیما تک پیش کرنے میں انہوں نے ایک طویل فنکارانہ ادبی سفر طے کیا تھا۔

قاسمی صاحب کی زیادہ تر کہانیوں کے پلاٹ اور کردار دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جس طرح پریم چند نے اُتر پردیش کی دیہی زندگی کو اپنا مرکز بنایا اس طرح قاسمی صاحب کی کہانیاں بھی مغربی پنجاب کے گاؤں کی زندگی کے گرد وپیش گھومتی ہیں اور انہوں نے بڑے دلپذیر انداز میں اس دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے جہاں اُن کا بچپن گزرا تھا اور جس کی مٹی کی بو باس اُن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ اور یہ گاؤں میں رہنے کا ہی اثر تھا کہ انہیں غریب کسانوں اور مزارعوں سے ہمدردی، اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کرنے والے زمینداروں اور جاگیرداروں سے شدید نفرت ہوگئی۔ اور اس ہمدردی اور نفرت کے جذبے کا اظہار بعد ازاں انہوں نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کے توسط سے کیا اور ان کی زندگی کو ہمارے سامنے بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔

اگرچہ ندیم کی ابتدائی کہانیوں میں دیہی ماحول اور زندگی کا بول بالا ہے جس میں غریب اور لاچار عوام جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعہ پریشان اور ستائے ہوئے ہیں۔ اور استحصال کا شکار ہیں۔ مگر بعد ازاں اپنی تخلیقات ''سناٹا'' اور ''بازارِ حیات'' میں فن کی ارتقائی منزل طے کرتے ہوئے وہ اُس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ زندہ اور متحرک کردار پیش کرتے ہیں اور اُن کی تکنیک میں بھی ارتقائی عمل کچھ تیز ہوگیا ہے۔ اس کے بعد وہ ترقی پذیر دور میں یہ کوشش شعوری طور پر کرتے

www.taemeernews.com

ہیں کہ کرداروں کے اندرونی حالات میں تبدیلی لائی جائے۔اور بالآخر وہ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے مگر انہوں نے انتہا پسندی کے بجائے ہمیشہ اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ بعض ترقی پسندوں کے ان نظریات سے قطعی اتفاق نہیں کرتے تھے جو مذہب، خدا کی مخالفت اور دہریت میں ایقان کو ہی ترقی پسندی خیال کرتے ہیں۔تاہم وہ مارکس واد سے ضرور متاثر تھے اور وہ بھی ملک کے غریبوں کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلا کر ایک مساوات اور انصاف پر مبنی نظام لانے کے آرزومند تھے اور اسی مقصد کے تحت ہی انہوں نے اپنی کہانیاں لکھیں۔ اُن کی کہانیوں کے موضوعات بھی استعماریت کے شکار مزدور، غریب عوام، ظالم جاگیردار اور طوائفیں ہیں اور یہ سب کردار شہری زندگی کے بھی ہیں اور دیہی زندگی کے بھی۔انہوں نے کبھی بھی سماجی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا اور اُن کی کہانیوں میں ان کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔مگر اُن کی کہانیوں میں نہ تو منٹو کی طرح جنسی چاشنی کی لذت ہے اور نہ کرشن چندر کی طرح رومان میں ڈوبی حسین زندگی۔ یہ سچ ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد اُن کی بعض تخلیقات میں جنس کا ذکر ضرور آیا ہے مگر اسے درحقیقت کردار اور پلاٹ کی ضرورت کے پیش نظر ہی بیان کیا گیا ہے۔

قاسمی صاحب کی کہانیوں میں شاعرانہ حسن و جمال جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ یہ حسن کبھی کرداروں کی صورت میں تو کبھی ماحول کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر قاسمی صاحب ایک شاعر تھے لہذا وہ جمالیات کے بھی پرستار تھے۔اس کے علاوہ وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی کہانیوں میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔مگر غیر حقیقی اور دیومالائی قسم کی کہانیوں سے وہ

www.taemeernews.com

ہمیشہ گریز کرتے رہے۔اور اُن کی کہانیاں ہمیشہ حیات انسانی کے انتہائی نزدیک رہیں اُن میں دیو مالائی کردار نہیں بلکہ ہماری طرح گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان ملتے ہیں۔انہوں نے وہی لکھا جو اُن کے تجربے میں آیا اور حقیقت پر مبنی تخلیقات ہی پیش کیں۔حقیقت پسندی کو اپنا کر ایک طرح سے انہوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اُن کی کہانیوں کے موضوع معاشی اور سماجی مسائل ہیں جو ہماری زندگی میں ہمیں قدم قدم پر پیش آتے ہیں۔ جنگ کی تباہیاں اور بربادیاں جن کا نشانہ غریب اور حاجتمند افراد کو اپنی مادی ضروریات سے مجبور ہو کر بننا پڑتا ہے، اُن کے لئے سوبانِ روح ہیں۔دنگے جو انسانیت کے خون کو پانی سے بھی ارزاں بنا دیتے ہیں اُن سے بھی انہیں انتہائی نفرت رہی۔جاگیردارانہ نظام جس میں طاقتور کمزور کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام جس میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے، ان موضوعات پر بھی انہوں نے بہت سی یادگار کہانیاں قلمبند کیں۔

اُنہوں نے اپنی کہانیوں میں بعض اوقات ایسی شاعرانہ اور مسحور کن فضا پیدا کر دی جسے پڑھ کر قاری جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔فطرت اور ماحول کی عکاسی میں اُن کا کوئی جواب نہیں وہ اپنے افسانے کے بنت میں جس مہارت و دسترس کا کمال دکھاتے ہیں وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا ہے۔تاہم بعض اوقات وہ بھی واقعات کے بیان میں عام افسانہ نگاروں کی طرح مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تاہم اُن کی کہانیاں اُن کی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانی اور سماجی مسائل پر گہری نظر کی بھی مظہر ہیں۔جیسا کہ مشہور اُردو نقاد سید وقار عظیم نے اُن کی کہانیوں پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی قاسمی کی کہانیوں کے بارے میں مجھے ایک جملے میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گا کہ اُن

www.taemeernews.com

کی کہانیاں انسانیت اور فن کے اعلیٰ ترین اقدار کی کہانیاں ہیں۔

قاسمی صاحب کی کہانی کے میدان میں contributuin یہ ہے کہ قارئین کو 'پرمیشر سنگھ'، 'بین'، 'ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'، 'الحمدللہ'، 'رئیس خانہ'، 'لارنس آف تھلیا'، 'ثواب'' اور 'کنجری' ایسی متعدد یادگار کہانیاں دینے کے باوجود آخر عمر تک ان میں یہ تڑپ اور دلی تمنا رہی کہ وہ اُردو ادب اکو اپنی بہترین تخلیق پیش کریں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے کبھی ناول لکھنے کی جانب توجہ نہیں دی تھی حالانکہ اُن سے کئی بار اس کی فرمائش بھی کی گئی تھی مگر اب موت سے کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے انہیں اپنے پرانے کاغذات میں خستہ حالت میں ایک ناولٹ کا پرانا مسودہ مل گیا تھا جو دوسری جنگِ عظیم سے متعلق ہے جب پنجاب سے رنگروٹوں کی دھڑ ادھڑ بھرتی ہو رہی تھی۔ یہ ناول جنگ کے دور سے شروع ہو کر قیام پاکستان کی تحریک تک کے حالات پر محیط ہے اور اب یہ ''ایک ریوڑ..... ایک انبوہ'' کے عنوان سے فنون میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔

بحیثیت شاعر بھی وہ اپنے دَور کے چند معروف شعراء میں سے ایک تھے اور افسانے کی طرح شاعری میں بھی اُن کا مقام و مرتبہ بہت بلند رہا ہے۔ اُن کی شاعری کے اعلیٰ و بلند معیار کی سب نے تعریف کی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی جیسا شاعر جو بہت کم ہی کسی کی تعریف کرتا ہے، وہ بھی اُن کی شاعری کے بے انتہا معترف تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ شاعری و انسانیت کے پیمبرانہ معیار پر نگاہ کر کے جب قاسمی صاحب کی جانب نظر اُٹھاتا ہوں تو بلا خوف ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر اور، انسانیت و شعریت کا ایک ایسا دل کشا سنگم ہے جس کا اور چھور نہیں مل سکتا۔

قاسمی صاحب کی شاعری کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی جب مولانا محمد علی

www.taemeernews.com

جوہر کے انتقال پر اُن کی پہلی نظم روزنامہ ''سیاست'لاہور کے سرورق پر شائع ہوئی اور یہ اُن کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہی نہیں بعدازاں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۷ کے دوران بھی اُن کی متعدد نظمیں روزنامہ ''انقلاب'' لاہور اور ''زمیندار'' لاہور کے سرورق پر شائع ہوتی رہیں اور اس سے انہیں عالمِ نوجوانی میں ہی غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

ابتدا میں قاسمی صاحب نے بھی عام شاعروں کی طرح رومانی انداز و اسلوب اپنایا لیکن اُس میں بتدریج تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور بالآخر وہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچے جہاں اُن کی شاعری نے حقیقت پسندی کا نظریہ اپنالیا اور وہ انسان دوستی اور سماجی مساوات وانصاف کی علمبردار بن گئی اور ساتھ ہی اس میں وسعت اور گہرائی بھی در آئی۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ شاعر کے ساتھ ساتھ انسان بھی تھے ۔ انہوں نے انسانیت اور امن وآشتی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ اپنی شاعری میں نئی زندگی اور نئے نظام کے اقدار کی باتیں کرتے تھے اور اس دھرتی پر نئے آدم کے آنے کے زندگی بھر منتظر رہے جو انسانیت کا پیکر ہوگا اور جس کی آمد سے پیار و امن اور انسان دوستی کے چراغ جگمگا اُٹھیں گے اور دھرتی امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ اُن کی شاعری میں زندگی رواں دواں اور رقصاں محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ حرکت ہی میں زندگی کا حسن پنہاں دیکھتے تھے۔

نثر میں بھی انہوں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اور کئی یادگار کتابیں چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں ''تہذیب وفن''، ''ادب اور تعلیم کے رشتے'' اور ''علامہ محمد اقبال'' ایسی کتابیں پیش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ادیب ساتھیوں کے بارے میں اپنی یادیں ''میرے ہم سفر'' کے نام سے قلمبند کیں جن سے ہمارے عہد کے بہت سے شعراء و ادباء کی زندگی کے کئی عجیب

www.taemeernews.com

وغریب پہلوؤں سے جانکاری حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انہوں نے میدان صحافت میں بھی نمایاں کردار نبھایا ہے اور اس میدان میں بھی اُن کی خدمات کبھی نظرانداز نہیں کی جاسکیں گی۔ انہوں نے اپنے صحافتی سفر کی ابتدا اپنے دَور کے مشہور ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت سے کی۔ بعدازاں وہ ''نقوش''، ''سویرا''، ''سحر'' اور روزنامہ ''امروز'' ایسے موقر اخبارات و جرائد سے منسلک رہے اور ۱۹۶۳ء میں انہوں نے اپنا نجی جریدہ ''فنون'' نکالنا شروع کیا جس کے ۱۴۰ شمارے اُن کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے اور جسے برصغیر کے جریدوں میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اُردو کے متعدد روزناموں کے لئے فکاہیہ کالم بھی لکھے جنہیں قارئین نے بے حد پسند کیا۔ ان میں اُن کے یادگار فکاہیہ کالم حرف و حکایت (امروز) پنج دریا (ہلالِ پاکستان)، موج در موج (احسان لاہور) لاہور ..... لاہور ہے (روزنامہ جنگ کراچی) لاہوریات (روزنامہ حریت کراچی) وغیرہ شامل ہیں۔ اپنی طویل صحافتی زندگی میں انہیں کئی بار نظریاتی معرکہ آرائیوں سے بھی واسطہ پڑا مگر وہ اپنے مخالفین کی باتوں کا جواب بڑے تحمل و اعتدال سے دیتے رہے، اور انہوں نے کبھی بھی اپنے معترضین کی طرح شدت اور انتہاپسندی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

بلاشبہ قاسمی صاحب کے انتقال سے ہم ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو پون صدی تک میدان ادب میں سرگرم عمل رہی۔ وہ ممتاز افسانہ نگار، غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھنے والے نامور شاعر، موقر اخبارات و جرائد کے کامیاب مدیر، فکاہیہ کالم نویس کے ساتھ ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے میدان میں اپنی تخلیقات کو متواتر پیش کرنے والے واحد سرگرم ادیب تھے جنہوں نے شہرت

www.taemeernews.com

کی ایسی بلندیوں کو چھوا جو بہت کم ادباء وشعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی گراں قدر ادبی خدمات سے جو امٹ نشان چھوڑے ہیں وہ کبھی مٹ نہ سکیں گے اور اُردو شعروادب کی تاریخ اُن کے ذکرِ خیر کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکے گی۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

جگن ناتھ آزاد

پیدائش: ۵؍دسمبر ۱۹۱۸ء عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پاکستان)

وفات: ۲۵ جولائی ۲۰۰۴ء (دہلی)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شاعر اور ماہرِ اقبالیات

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد صاحب کا نام پہلے پہل مَیں نے راولپنڈی میں طالب علمی کے زمانے میں سنا تھا جب اُن کے والد اور اُردو کے ممتاز شاعر تلوک چند محروم گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھایا کرتے تھے۔ شاعری تو آزاد صاحب بھی شروع کر چکے تھے مگر اُن دنوں اُن کی پہچان محروم صاحب کے بیٹے کی حیثیت سے ہی تھی، بطور شاعر اُن کی اپنی کوئی منفرد شناخت نہیں تھی۔ وہ لاہور سے کبھی کبھار راولپنڈی آیا کرتے تھے مگر اُن کا زیادہ تر قیام لاہور ہی میں ہوتا تھا اور تقسیم کے بعد بھی وہ لاہور ہی سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے اور روزنامہ ''ملاپ'' سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن جب وزارتِ اطلاعات ونشریات کے پبلی کیشن ڈویژن سے شائع ہونے والے رسائل ''آج کل''، ''بساطِ عالم'' اور ''نونہال'' کی ایڈیٹری کے لئے حکومتِ ہند نے شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کو منتخب کیا تو اُس کے بعد انہیں مدد دینے کے لئے تین اسسٹنٹ ایڈیٹروں کی ضرورت پڑی جس کے لئے عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور مشہور افسانہ نگار بلونت سنگھ کو منتخب کیا گیا۔ بلونت سنگھ تو خیر کچھ عرصہ بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرنے کے بعد مستعفیٰ ہو کر الہ آباد چلے گئے اور وہاں

www.taemeernews.com

ہوٹل کا کاروبار کرنے لگے۔ اب آزاد صاحب اور عرش ملسیانی ہی جوش صاحب کے مددگار و معاون رہ گئے۔ بعدازاں دسمبر ۱۹۵۵ء تک اس ماہنامہ سے وابستہ رہنے کے بعد آزاد صاحب بھی انفارمیشن آفیسر بن کر پریس انفارمیشن بیورو چلے گئے۔

راولپنڈی میں تو مجھے کبھی آزاد صاحب کو دیکھنے یا سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن جب میں ماہنامہ ''آج کل'' سے (۷۹۔۱۹۶۴ء) وابستہ ہوا تو دفتر میں کئی بار اُن سے ملاقاتیں ہوئیں اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ وہ ایک عوامی رابطے کے آدمی تھے اور تعلقات کو ہمیشہ بنائے رکھنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ مَیں اپنی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے اُن کے بہت کم خطوط کا جواب دے پاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اکثر خطوط لکھتے رہتے تھے۔ چند سال پیشتر وہ مجھے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس کے بس اسٹاپ پر مل گئے تو بیس پچیس منٹ تک بات چیت کرتے رہے مگر خطوط کا جواب نہ دینے کی شکایت تو کیا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ وہ میرے بزرگ ہی نہیں ہماری وزارت کے بہت بڑے افسر بھی رہ چکے تھے۔

آزاد صاحب وزارت اطلاعات ونشریات میں کئی بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہنے کے بعد بالآخر ۱۹۷۷ء میں بحیثیت ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز سبکدوش ہوئے اور پھر ایک مدت تک جموں یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدازاں آنند نرائن ملا صاحب کی وفات کے بعد وہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر مقرر ہوئے اور پھر اسی حیثیت سے وہ بقیہ زندگی انجمن کی سرگرمیوں میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیتے رہے۔

تقسیم سے پیشتر آزاد صاحب لاہور میں روزنامہ ''جے ہند'' سے وابستہ تھے جس کے ایڈیٹر ممتاز صحافی اور فکشن نگار جمنا داس اختر تھے۔ جب ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو آزاد صاحب لاہور میں ہی تھے اور انہیں یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ریڈیو پاکستان کے افسران نے ان سے پاکستان کا پہلا قومی ترانہ

www.taemeernews.com

لکھوایا جولاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ:

اے سرزمینِ پاک!
ذرّے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
تندیِ حاسداں پہ ہے غالب تیرا سواک
دامن وہ سِل گیا ہے جو تھا مدتوں سے چاک
اے سرزمینِ پاک!

اپنے وطن کا آج بدلنے لگا نظام
اپنے وطن میں آج نہیں ہے کوئی غلام
اپنا وطن ہے راہِ ترقی پہ تیز گام
آزاد، بامراد، جواں بخت شاد کام
اے سرزمینِ پاک!
ذرّے تیرے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
اے سرزمینِ پاک!

ہندوستان ہجرت کرنے کے چند برسوں بعد ہی آزاد صاحب نے شاعری میں اپنے لئے ایک الگ اور منفرد مقام حاصل کرلیا تھا۔ اب وہ محروم صاحب کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معروف شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے لگے اور اُن کی شہرت برِصغیر میں اتنی پھیلی کہ شاید ہی کوئی بڑا مشاعرہ ہو جس میں انہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ خصوصاً پاکستان میں تو وہ بہت ہی مقبول شاعر تھے۔ اُن کی مشہور نظم کے درج ذیل شعر ؎

www.taemeernews.com

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

نے تو اہل پاکستان کو اُن کا دیوانہ بنا دیا تھا اور یہ نظم انہوں نے لاتعداد مشاعروں میں پڑھی اور بے پناہ داد حاصل کی تھی۔

آزاد صاحب نے ہجرت کرنے کے باوجود پاکستان سے اپنی محبت اور اُنسیت میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیمِ ملک کے بعد انہیں اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا مگر حقیقتاً وہ ہمیشہ اسی ملک میں رہے۔ جسم ان کا یہاں تھا مگر ذہنی طور پر وہ پاکستان میں ہی رہے۔ اور بعض لوگ تو انہیں بطور طنز و طعنہ 'پاکستانی' بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو 'وطن میں اجنبی' محسوس کرتے تھے۔ اس لئے ہندوستان میں رہ کر انہوں نے ہمیشہ ہندو۔ پاک دوستی کے لئے فضا تیار کرنے میں ایک اہم رول انجام دیا۔ انہوں نے بے شمار ایسی نظمیں لکھیں جو اُن کی پاکستان کی جانب خیر سگالی کا ایک قدم کہہ سکتے ہیں۔ موت سے کچھ سال پہلے میں اُن کی ایک نظم ''جمنا کے کنارے'' ''چہارسو'' راولپنڈی میں شائع ہوئی تھی جس میں وہ وہاں کی محفلوں اور اپنے شاعر اور ادیب دوستوں کو یاد کر کے پرانی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔

شام کے سائے میں جمنا کی روانی دیکھ کر
مجھ کو اے آزاد راوی کا سماں یاد آگیا
اور راوی کے کنارے پر جو ہے آباد، وہ
آرزوؤں کا، امنگوں کا جہاں یاد آگیا
دل میں علمی محفلوں کی یاد تازہ ہوگئی
وہ ''ہمایوں'' کا مدیرِ نکتہ داں یاد آگیا
مہر و سالک۔ عابد و اقبال، تاثیر و ندیم

www.taemeernews.com

علم کا چھوٹا ہوا یہ کارواں یاد آ گیا
میکش و صوفی و پطرس حسرت و بیدار بخت
شاعری کا، نثر کا پورا جہاں یاد آ گیا
گونج اُٹھے احساس کی دنیا میں نغماتِ حفیظ
شعر و نغمہ کا یہ بحرِ بیکراں یاد آ گیا
تاجور وہ کشورِ شعر و ادب کا تاجور
علم و فن کا وہ امیرِ کارواں یاد آ گیا
دل سے جا سکتی نہیں آزاد! میرا جی کی یاد
ایک محبوب ِ نگاہِ دوستاں یاد آ گیا
ہائے اے بچھڑے ہوئے بھولے ہوئے لاہور تو
کس طرح یاد آ گیا، مجھ کو کہاں یاد آ گیا

اس میں شک نہیں کہ لاہور کی فرقت میں گوپال متل نے ''لاہور کا جو ذکر کیا'' سوم آنند نے ''کہاں گیا میرا شہر لاہور'' اور سنتوش کمار نے ''لاہور نامہ'' لکھ کر اپنی یادداشتیں قلمبند کر اپنے ماضی کے وطن کی یادوں کو تازہ کیا ہے مگر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے شاید آزاد صاحب سے زیادہ اور کسی نے اتنی منظوم تخلیقات پیش نہیں کیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آزاد صاحب ہندو پاک دوستی کے پُل تعمیر کرنے میں کوشاں ادباء و شعراء میں سرِ فہرست تھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

شاعری میں میں ان کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے جنہیں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ 'طبل و علم'، 'بیکراں'، 'ستاروں سے ذروں تک، وطن میں اجنبی، 'نوائے پریشاں'، 'کہکشاں'، 'بوئے رمیدہ'، 'گہوارۂ علم و ہنر' وغیرہ کی ادبی حلقوں میں جو پذیرائی ہوئی اس سے کون واقف نہیں۔

www.taemeernews.com

آزاد صاحب اُردو کے ایک بہت بڑے محسن تھے اور انہوں نے تقسیم کے بعد جب اُردو کو ختم ہونے کا اعلان کیا جا رہا تھا، اُردو کا پرچم بلند رکھا۔ اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب تقسیم کے بعد علامہ اقبال کے پاکستان کا قومی شاعر بن جانے کے بعد اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں اہل اُردو اُن کا نام لینے سے گریز کرتے تھے اور ایک عرصہ تک اُن کے بارے میں لکھنے اور بولنے سے گھبراتے رہے اور جب سرکاری حلقے بھی اس سلسلے میں بہت محتاط ہو گئے تھے تب یہ آزاد صاحب کا ہی حوصلہ و کارنامہ تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے علامہ اقبال کی حمایت میں آواز اُٹھائی حتیٰ کہ حکومتِ ہند کو بھی اُن کی صد سالہ تقریبات کے لئے تیار کیا اور یہی نہیں حکومتِ ہند کے پبلی کیشن ڈویژن سے انہوں نے اقبال کی البم ''مرقع اقبال'' شائع کرائی، ملک بھر میں اُن کی کتابوں اور تصویروں کی نمائشوں، سیمیناروں اور تقریبات کا اہتمام کر کے ایسی سازگار فضا بنائی کہ ہر جانب اقبال سے متعلق سیمینار اور تقریبات منعقد ہونے لگیں۔ اور یہ اُن ہی کا معجزہ و کارنامہ تھا کہ آج ملک میں اقبال کے نام لینے میں کسی کو ہچکچاہٹ اور خوف محسوس نہیں ہوتا اور ملک میں اقبال کو احترام و محبت سے یاد کیا جاتا ہے اور ملک میں اقبال سمان اور اقبال چیئر قائم ہونے کے علاوہ اُن پر کئی تحقیقی کام بھی ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

آج آزاد صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن انہیں اہلِ اُردو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے کیونکہ انہوں نے اپنے قدآور والد کی شخصیت کے بدولت نہیں بلکہ اپنی شاعری کے بل بوتے پر اور ماہر اقبالیات کہ حیثیت سے ایسی شہرت پائی کہ یہ صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ تمام دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا میں کوئی اُردو مرکز نہیں جہاں آزاد صاحب کو بحیثیت شاعر مدعو نہ کیا گیا ہو اور اُن کی شاعری نہ گونجی ہو اور اقبال سے متعلق کوئی بھی اہم سیمینار یا تقریب نہیں ہوئی جہاں اُنہیں نظر انداز کیا گیا ہو۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

جمنا داس اختر

پیدائش: ۲؍نومبر ۱۹۱۶ء (پاکستان)

وفات: یکم اگست ۲۰۰۹ء (دہلی)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ہمہ جہت شخصیت

جمنا داس اختر

برصغیر کے معروف و ممتاز صحافی، ادیب، ناول نویس، افسانہ نگار، ٹریڈ یونینسٹ اور سماجی کارکن جمنا داس اختر کا یکم اگست ۲۰۰۹ء کو نئی دہلی میں انتقال ہوگیا جن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے برسوں پہلے پاکستان کے نامور صحافی، شاعر، خطیب اور مجاہدِ آزادی شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''چٹان'' لاہور کے مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں لکھا تھا:

اب بھی پابندیٔ آئین و وفا باقی ہے
اب بھی انسان کے چہرے پہ حیا باقی ہے
اب بھی کچھ لوگ رہ و رسمِ وفا جانتے ہیں
اب بھی آوازۂ تسلیم و رضا باقی ہے

اور سچ مچ یہ نظم اختر صاحب کے کردار و شخصیت کی منہ بولتی تصویر ہے کیونکہ وہ ہمارے دَور کے ایک ایسے مردِ مجاہد تھے جو گزشتہ پون صدی سے صحافت و ادب کے علاوہ سماجی میدان میں بھی سرگرم عمل رہے اور جن کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف ملک کی متعدد نامور ہستیوں نے کیا تھا۔

www.taemeernews.com

میری اخترؔ صاحب سے پہلی ملاقات غالباً ۶۲۔۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت، نئی دہلی میں ہوئی تھی جہاں وہ جز وقتی طور پر لیکچرار تھے۔ مگر مَیں اختر صاحب کے نام سے بہت پہلے سے واقف تھا۔ اور یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے جب میں سناتن دھرم ہائی اسکول راولپنڈی میں نویں جماعت میں داخل ہوا تھا ۔ وہاں ایک دن ہمارے اُردو کے اُستاذ ''ماسٹر نرسنگھ داس'' جی نے پڑھائی کے دوران بڑے فخر سے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' معروف صحافی اور ادیب جمنا داس اخترؔ بھی اسی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں اور اسکول کو اس بات کا بے حد فخر ہے۔''

اخترؔ صاحب کو زیادہ تر اہلِ اُردو ایک ممتاز صحافی اور ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں حالانکہ اُن کی زندگی کے کئی اہم پہلو ہیں اور وہ کئی میدانوں میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ وہ ایک کامیاب ناول نویس، ممتاز سماجی کارکن، معروف ٹریڈ یونینسٹ ،شاعر اور تاریخ داں بھی تھے لہذا اُن کی ہشت پہلو شخصیت کو سمجھنے کے لئے اُن کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اخترؔ صاحب نے اپنی زندگی کی شروعات صحافت سے کی تھی اور اپنی طویل صحافتی زندگی میں کئی اخبارات سے وابستہ رہنے کے علاوہ انہیں بہت سے نامور اور تاریخ ساز صحافیوں اور مدیروں کے ساتھ کام کرنے کا یا اُن کی قربت میں رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ جیسے مولانا ظفر علی خاں، مہاشہ کرشن، عبدالمجید سالکؔ، غلام رسول مہر، میلا رام وفاؔ، مہاشہ خوشحال چند خورسند ایڈیٹر ملاپ، نانک چند نازؔ، پریتم ضیائی، گوری شنکر ساگر وغیرہ۔ ان کے علاوہ اُردو کے کئی نامور اور ممتاز ادیب اور شاعر مثلاً مالک رام، گوپال متل، ہنسراج رہبر اور رامانند ساگرؔ بھی ان کے ساتھ بطور صحافی کام کرتے رہے تھے۔

اخترؔ صاحب کی ولادت ۲؍نومبر ۱۹۱۶ء کو راولپنڈی (حال پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد کا تعلق موہیال براہمنوں کی دت شاخ سے تھا جنہیں حسینی

براہمنوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جن کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے اجداد نے میدانِ کربلا میں حضرت حسین کا سر لانے کے لئے یزید سے جنگ کی تھی۔ مگر اختر صاحب کو اپنے حقیقی والدین کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا کیونکہ ان کے پھوپھا مہتہ بھگوان داس چھبر نے انہیں گود لے کر اپنا بیٹا بنالیا تھا جس سے اُن کا سلسلہ نسب بھائی متی داس کے معروف خاندان سے جا ملتا ہے۔ یہ وہ خاندان ہے جس میں بھائی بالمکند چھبر اور بھائی پرمانند ایسی نامور ہستیاں گزری ہیں۔

اُن کے پھوپھا مہتہ بھگوان داس چھبر راولپنڈی میں سرکاری ملازمت میں تھے مگر انہیں سیاست اور صحافت میں بے حد دلچسپی تھی لہذا ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ ایک مقامی اخبار ''شانتی'' میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے جس کے ایڈیٹر مہتہ کشن چند موہن تھے جنہیں خلافت تحریک کے دنوں میں برطانوی سرکار نے گرفتار کرلیا تھا اور جس کے نتیجے میں اخبار بند ہوگیا تھا۔ بعد ازاں اس اخبار کو دوبارہ جاری کیا گیا مگر مہتہ کشن چند کو انگریزی حکومت نے دوبارہ گرفتار کرلیا اور ساتھ ہی پریس بھی ضبط کرلیا جس کے نتیجے میں اخبار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ اختر صاحب کو صحافت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

بھگوان داس چھبر جی کی دیکھا دیکھی اختر صاحب کو بھی بچپن سے ہی صحافت میں دلچسپی ہوگئی اور ۱۹۳۱ء میں وہ بحیثیت نمائندہ روزنامہ ''بندے ماترم'' اور آئندہ برس ''سناتن دھرم پرچارک'' امرتسر اور ''ارجن'' کے ادارے سے وابستہ ہوگئے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں ترقی کر کے وہ روزنامہ ''بندے ماترم'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔

دو تین سال لاہور میں بطور اخبار نویس ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں وہ واپس راولپنڈی آگئے اور وہاں سے انہوں نے ہفت روزہ ''پیشوا'' کی شروعات کی مگر یہ اخبار زیادہ مدت نہ چل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوبارہ ۱۹۳۶ء میں

www.taemeernews.com

لاہور منتقل ہو گئے۔اور روزنامہ ''ویر بھارت'' میں بحیثیت جائنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔ پھر ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں وہ مذکورہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے روزنامہ ''بھارت ماتا'' لاہور میں اور ۱۹۳۹ء میں مہاشہ خوشحال چند خورسند کے اخبار روزنامہ ''ملاپ'' میں بحیثیت جائنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔ ۱۹۴۳ء میں ہندی روزنامہ ''وشو بندھو'' میں جائنٹ ایڈیٹری کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ''ایلائنڈ پریس سروس'' کی بھی شروعات کی جو حصولِ آزادی کے ایک سال بعد تک بھی چلتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ دہلی آ گئے اور روزنامہ ''تیج'' میں چیف ایڈیٹر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۵۵ میں وہ اس اخبار کو چھوڑ کر چودھری برہم پرکاش کے روزانہ اخبار ''سنسار'' سے وابستہ ہو گئے اور کچھ مدت بعد انہیں گوپی ناتھ امن کی جگہ اس کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اپنا نجی ہفت روزہ ''سویرا'' جاری کیا جسے بعد ازاں انہوں نے روزنامے میں منتقل کر دیا۔ یہ اخبار تقریباً ۳۳ سال تک جاری رہا اور ۱۹۸۹ء میں بوجوہ بند ہو گیا۔

۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء کے دوران ''سویرا'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۸۳۔۱۹۷۵ کے دوران وہ روزنامہ ''جنگ'' کراچی اور ڈیلی نیوز کراچی سے بطور کالم نویس وابستہ رہے۔ ۸۰۔۱۹۷۹ء کے دوران وہ لندن میں قیام پذیر رہے اور اس دوران وہ قدیم تاریخ میں تحقیق کرنے کے علاوہ انگریزی کے روزنامے ''پائنیر (Poineer) میں نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ لیبر پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اسی دوران برمنگھم کی کاؤنٹی کونسل کے انتخاب کے دوران انہوں نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ بعد ازاں ان کی مذکورہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لیبر پارٹی نے ایک تقریب میں ان کی عزت افزائی بھی کی تھی۔ اسی عرصے میں لندن اور برمنگھم میں بی بی سی اور واشنگٹن میں وائس

www.taemeernews.com

آف امریکہ نے ان کے انٹرویو نشر کئے۔ اس کے علاوہ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے ''پریم سبھا'' کی بنیاد رکھ کر وہاں آباد ہندوستانیوں اور پاکستانیوں میں اتحاد و دوستی کو بھی تقویت بخشی۔

اختر صاحب کی صحافتی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لگ بھگ پون صدی سے زیادہ عرصہ تک اس پیشے سے وابستہ رہے مگر وہ اسے پیشہ نہیں بلکہ ایک مقدس فریضے کی طرح انجام دیتے رہے۔ اُن کا فرمانا تھا کہ اخبار نویس کا کام صرف خبروں اور فیچروں کا ترجمہ کرنا یا کرانا، انہیں ترتیب دینا یا اداریہ لکھ کر اخبار کو مکمل کرنا نہیں بلکہ خبروں کے معاملے میں اخباروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ بازی کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مدِ مقابل یا حریف بازی نہ لے جائے۔ نیز ان کا کہنا تھا کہ اخبار نویسی کو ایک مقدس فرض اور مشن مان کر اخبار نویس کو کرپشن، بد دیانتی، ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

اختر صاحب صرف اس کی تلقین ہی نہیں کرتے تھے بلکہ زندگی بھر کرپشن اور بد دیانتی کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ سبارڈی نیٹ سروسز سیلیکشن بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے اپنے محکمے کو حتیٰ الوسع کرپشن سے پاک صاف رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ کسی وزیر یا بڑے شخص کی سفارش یا دباؤ کی بھی پروا نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کا ایک وزیر اپنے کسی رشتہ دار کی دو نالائق لڑکیوں کو سروس میں مستقل کروانا چاہتا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اُن کے بورڈ کے ایک رکن نے انہیں دو ہزار روپے کے نوٹ پیش کر کے چھ امیدواروں کی سفارش کی۔ مگر انہوں نے رشوت قبول کرنے کے بجائے اُن امیدواروں کو نااہل قرار دینے کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ پنجاب سے شکایت کر دی۔ پھر محکمے کے اراکین اور عملے کی بدعنوانیوں سے تنگ آ کر ایک دن اچانک ایک پریس کانفرنس کر کے وزراء اور سیاسی رہنماؤں کے سفارشی خطوط کی نمائش کر کے سب کو بے نقاب کر دیا اور گورنر سے درخواست کی کہ وہ

www.taemeernews.com

بورڈ بذا کو توڑ دیں۔ اسی طرح آل انڈیا پوسٹ مین یونین کے سیکرٹری کو بھی اکاؤنٹس میں بد دیانتی کے الزام میں انہوں نے یونین سے نکال دیا تھا۔

صحافتی میدان میں اختر صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی طویل صحافتی زندگی کے دوران صرف اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر ہی کام نہیں کیا بلکہ وہ جنگ کے محاذوں پر بھی رپورٹنگ کرنے گئے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کشمیر اور پنجاب کے جنگی محاذوں کا دورہ کیا اور اخبارات کو ان سے متعلق خبریں فراہم کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ پاکستانی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے سوویت روس کے دورے پر گئے۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ امریکہ کے دورے پر گئے تو ورجینیا اور واشنگٹن کے میئروں نے ان کی عزت افزائی کی۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پریس کلب کراچی نے استقبالیہ دے کر ان کی پذیرائی کی تھی اور ۱۹۸۶ء سے وہ وینکوور (کینیڈا) کے انڈو کینیڈین ٹائمز کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ ۱۹۴۹ء سے ابھی چند سال پہلے تک آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی مسلسل خدمات انجام دیتے رہے۔

صحافت کے علاوہ اختر صاحب میدان ادب میں بھی برسوں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے لگ بھگ تین درجن ناول تخلیق کئے ہیں جن میں آگ، جلن، کانٹے، آنسو، سونا کا پھی تن کے اجلے من کے میلے، بردہ فروش، پائل، کالے سائے، بھوانی جنکشن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں سے بعض ہندی، گجراتی، تلگو اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر ان زبانوں کے قارئین سے داد تحسین پا چکے ہیں۔ ان ناولوں میں سماج کی ٹھکرائی ہوئی بے بس، مظلوم اور لاچار عورتوں، سماجی ناانصافی اور عدم مساوات، فرقہ وارانہ فسادات اور ملک میں پنپ رہی بدعنوانی

www.taemeernews.com

اور کرپشن کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ان ناولوں کے علاوہ انہوں نے نے متعدد افسانے بھی قلمبند کئے ہیں اور ''کانٹے'' کے نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا تھا۔انگریزی میں ان کا ایک ناول Storms of Tears بھی شائع ہوا تھا اور پنجابی میں ''بچھی'' نام سے بھی ان کا ایک ناول شائع ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ سیاسیات پر بھی ان کی تین کتابیں اشاعت پذیر ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

فکشن کے علاوہ اختر صاحب نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی مگر ان کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور ان کی زیادہ تر شاعری اخباری ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آئی تھی۔غالباً انہوں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا اور ان کی صحافتی انداز کی یہ شاعری ان کے ذریعہ معاش کے زیرِ اثر ہی تخلیق ہوتی رہی۔خود انہوں نے بھی اپنی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری برآمد کی بات نہیں بلکہ حالات کی مجبوری اور ضرورت ایجاد کی ماں والا معاملہ ہے۔وہ روزانہ ''تیج'' دہلی کے لئے ''ماڈرن غزل'' کے عنوان سے ایک مدت تک شعر گوئی کرتے رہے۔اگر اُن تمام نظموں اور غزلوں کو یکجا کیا جاتا تو ایک اچھا خاصا دیوان وجود میں آجاتا۔مگر اب اس طرح کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ ایک تو اختر صاحب نے اس بارے میں سنجیدگی سے کبھی سوچا نہیں تھا اور نہ اس خیال سے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کیا تھا اور جو تھوڑا بہت کلام ایک چھوٹی سی بیاض کی صورت میں ان کے پاس موجود تھا، وہ بھی اُن کا کوئی پرستار اور قدردان اُن کی ڈرائنگ روم نما لائبریری سے دورانِ ملاقات اُڑا کر لے گیا تھا۔اور اس طرح ان کا یہ بچا کھچا شعری سرمایہ بھی تلف ہو کر رہ گیا۔تاہم اُن کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

طوفانِ حوادث سے گزرنا سیکھو
موجوں کے تھپیڑوں سے اُبھرنا سیکھو

www.taemeernews.com

اس دور کی آواز یہی کہتی ہے
جینے کی تمنا ہے تو مرنا سیکھو

☆

اے کاش شب غم کا سویرا آئے
اس سمت بھی امید کا جھونکا آئے
بیمار کو تسکین سی آ جائے گی
قاتل ہی کے پردے میں مسیحا آئے

☆

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

موج غم اب ہم تو ہارے
دیکھیں تو کس گھاٹ اُتارے
ہم نے کیا منزل کی سوچی
مدھم پڑ گئے چاند ستارے
ایوانوں میں جشنِ چراغاں
میرے گھر میں گھور اندھیارے
ایک تمہیں ہو سنگدل ورنہ
روئے اکثر چاند ستارے

چونکہ اکثر کلام سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے اس لئے ان میں بھرپور طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ جیسے:

بیٹے کو کیا پتا تھا نکل آئے گا ادھر
دیکھا جب اُس نے باپ کو شرما کے پی گیا

www.taemeernews.com

محفل میں کہہ دیا کہ مَیں ہوں پرہیز گار
قربان اس ادا پہ گھر آ کے پی گیا

☆

خدا شیطان سے اک روز یہ رو رو کے کہتا تھا
کہ مَیں ہی جانتا ہوں کیا مصیبت ہے خدا ہونا

☆

آسماں پر جب کبھی کالی گھٹا چھا جائے ہے
لومڑی کو اپنے لومڑ کا خیال آجائے ہے
منتری بننے کے جھانسے میں تو میں آتا نہیں
جا کسی لیڈر کے گھر میں کیوں میرا سر کھائے ہے
بھوک ہڑتالی بنا کر ہم کو وہ نیتا بنے
بھوک سے تڑپا کئے ہم اور وہ پھل کھائے ہے
وہ سمگلر ہے مگر پکڑا نہ جائے گا کبھی
شہر کا ڈپٹی کمشنر اس کے ہاں روز آئے ہے
جاں چھڑانے کے لئے کشکول میں کچھ ڈال دو
وہ تو ہے پاپی پرانا بن لئے کب جائے ہے
غیر کے پہلو میں بیٹھا ہم سے وہ شرمائے ہے
''ہم اُسے دیکھا کریں کب ہم سے دیکھا جائے ہے''
یہ کسی دھنوان کی ارتھی ہے اختر اس لئے
ہر کوئی بڑھ بڑھ کے اس پر پھول یوں برسائے ہے
دھرم رکشک کی اُپادھی اب تو مل جائے حضور!
بھینس مَیں نے بیچ کر اب باندھ لی اک گائے ہے

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

کے عجائب گھر، فرانس کے ٹو درے میوزیم، امریکن لائبریری آف کانگریس اور قاہرہ میں تحقیق و مطالعہ کیا تھا۔ ان اداروں کے علاوہ انہوں نے بغداد اور انقرہ کے عجائب گھروں سے چار ہزار سال پرانی دستاویزات کی فوٹو کاپیاں بھی حاصل کی تھیں۔

اختر صاحب کی ادبی علمی، صحافتی اور سماجی خدمات کے لئے متعدد انجمنیں ادارے اور ریاستی حکومتیں انہیں اعزازات و انعامات عطا کر چکی ہیں۔ دہلی اُردو اکادمی اور حکومتِ پنجاب کے بھاشا و بھاگ نے انہیں ایوارڈ عطا کئے تھے۔ اس کے علاوہ موخر الذکر ادارے نے ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کر کے ان کی پذیرائی بھی کی تھی۔ میرا کادمی لکھنؤ اور ماتری شری کمیٹی نے بھی ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزازات سے نوازا تھا۔ نیز برطانیہ کی انجمن ترقی اُردو برمنگھم نے بھی ایک تقریب میں انہیں اعزاز سے نواز کر ان کی پذیرائی کی تھی۔

اختر صاحب نوے اکیانوے سال کی عمر تک نوجوانوں کی طرح ادبی، تاریخی اور صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ اُردو ہندی پنجابی اور انگریزی کے کئی اخبارات کے لئے کالم نویسی کرتے رہے اور ریڈیو اور دوردرشن کے لئے بھی اپنی خدمات فراہم کرتے رہے لیکن گزشتہ ڈیڑھ سال سے ان کی صحت کچھ جواب دے گئی تھی اور ان کی سرگرمیاں موقوف سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ بوڑھاپے کی وجہ سے ان کی یادداشت بھی کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ تاہم اگر کوئی ملاقاتی یا انٹرویو لینے والا آجاتا تو وہ ماضی کے تاریخی، سیاسی ادبی اور صحافتی واقعات کو بڑے تسلسل سے بیان کرتے تھے۔ اور آج ان کے اُٹھ جانے سے ہم ایک ایسی قد آور شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو ایک ممتاز صحافی اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک نامور سماجی کارکن اور ترقی پسند یونینسٹ بھی تھا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

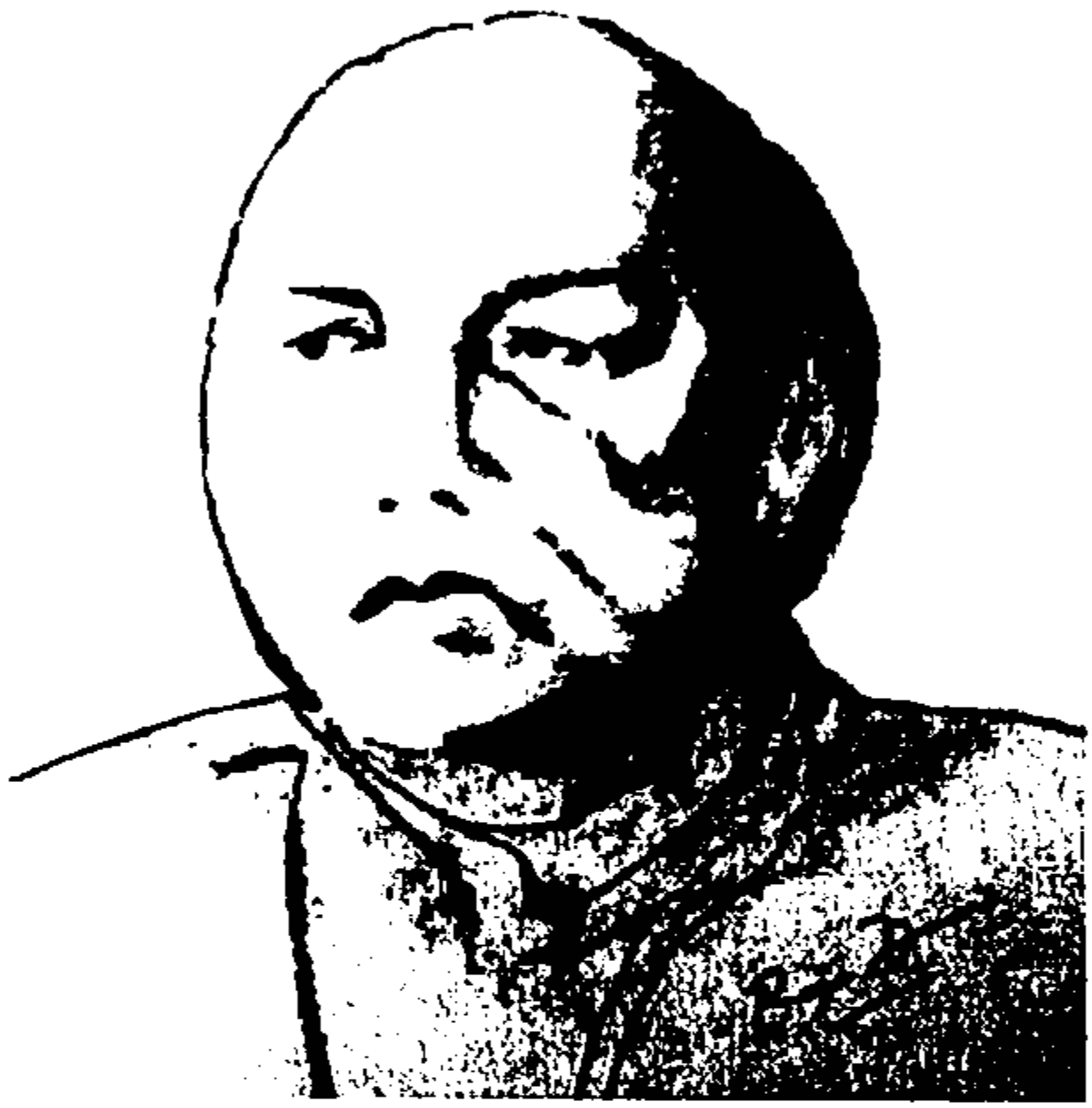

حبیب جالب

پیدائش: ۲۴/ مارچ ۱۹۲۸ء میانی افغاناں، ہوشیار پور (پنجاب)

وفات: ۱۲/ مارچ ۱۹۹۳ء لاہور (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

عوام کا محبوب شاعر

حبیب جالب

موجودہ صدی میں ہمیں اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، حفیظؔ، احسان دانش ایسے کئی عظیم المرتبت شاعر نصیب ہوئے جن پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ لیکن اس صدی کے وسط میں دنیائے شاعری میں ایک ایسا ممتاز و منفرد شاعر نمودار ہوا جس نے اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر رکھی تھی اور جو مرتے مرتے مر گیا لیکن نہ تو قید و بند سے اس کے ارادے متزلزل ہوئے اور نہ ہی آمرانہ جبر و استبداد ہی اُسے اپنی راہ سے ہٹا سکے۔

اس ہر دل عزیز اور عوام کے محبوب شاعر کا نام تھا حبیب جالب جو برسوں اپنے ملک کے عوام کی بہتری و خوشحالی اور درخشندہ مستقبل کی خاطر صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد آخر ۱۹۹۳ء کی ۱۲ اور ۱۳ مارچ کی درمیانی شب کو لاہور کے ایک ہسپتال میں دم توڑ گیا اور اُردو ادب ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گیا جس کی شخصیت اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں ملتا تھا اور جو گفتار کا ہی نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔

جالبؔ ۲۴ر مارچ ۱۹۲۸ء کو میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا

www.taemeernews.com

ہوئے اور برِ صغیر کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے لیکن وہاں جا کر اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ ملک پے بہ پے سیاسی بحرانوں کا شکار ہو رہا تھا اور اقتدار کی جنگ میں رہنما عوام کو بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ایسے حالات میں اُن کی شاعری میں شدت پیدا ہوگئی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔جیسا کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعہ ''حرف سرِ دار'' کے دیباچے میں تحریر کیا ہے:

> ''برگِ آوارہ دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوڑے ہوئے دیاروں، بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔جگہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیما لہجہ بلند آہنگ ہوگیا ہے۔کیوں نہ ہوتا ؟ایک منظم منصوبے کے تحت وطن عزیز کو خوفناک آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا، جتنا حبس بڑھتا گیا لہجہ اُتنا ہی تیز و تند ہوتا گیا۔اس لہجے کی وجہ سے کئی بار پسِ دیوارِ زنداں بھی گیا اور ہر بار زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔''

ملک کی ڈانواڈول اور غیر یقینی صورتِ حال میں جب جنرل ایوب نے عوام پر فوجی حکومت مسلط کر دی تو انہوں نے کھُل کر مخالفت کی حتیٰ کہ اُن کی انقلابی شاعری جنرل ایوب خاں کے خلاف مس فاطمہ جناح کی الیکشن مہم میں ایک طرح سے مینی فیسٹو کی حیثیت اختیار کر گئی اور پھر جب فوجی دَورِ حکومت میں ملک پر عوام دشمن دستور نافذ کیا گیا تو انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا نظم ''دستور'' لکھی جس نے ملک میں تہلکہ مچا دیا اور ساتھ ہی اُن پر صعوبتوں اور اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ نظم ہر کہ و مہ کی زبان پر تھی اور ہر طرف یہ آواز گونج رہی تھی۔

www.taemeernews.com

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
مَیں نہیں مانتا، مَیں نہیں مانتا

جالبؔ کو جنرل ایوب، یحییٰ خان اور ضیا الحق کے دَورِ حکومت میں ہی نہیں بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اُن پر بھی حیدر آباد سازش کیس میں مقدمہ چلایا گیا مگر اس کے باوجود اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ ہمیشہ جابر و آمر سے ٹکراتے رہے اور سیاسی بازی گروں اور صاحبانِ اقتدار کی جھوٹ کی قلعی کھولنے سے انہیں دار و رسن بھی باز نہ رکھ سکے۔ بقول اُن کے:

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر قید

جیسا کہ ہم جانتے ہیں حبیب جالب کی شاعری اس دَور کی پیداوار ہے، جب حصولِ آزادی کے بعد برصغیر سیاسی بحران کا شکار تھا او سیاسی رہنما تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے اور ہر شے بکاؤ بن چکی تھی مگر ایسے دَور میں یہ شاعرِ حساس دلیری و بے باکی اور استقلال و ثابت قدمی کی علامت بن کر عوام کے سامنے نمودار ہوا اور اُس نے سہمے اور خوفزدہ عوام میں اپنی شاعری سے نئی روح پھونکنے کی کوشش کی حتیٰ کہ جب فوج مشرقی پاکستان میں نہتے اور بے قصور انسانوں پر ظالم ڈھا رہی تھی اور اکثر نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی، اُس وقت بھی اس بیباک و حوصلہ مند عوامی شاعر کو فوجی جبر و استبداد خاموش نہ

www.taemeernews.com

کر سکا اور اُس نے ببانگ دہل کہا:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

اس میں شک نہیں کہ جالبؔ کی شاعری پاکستانی پس منظر میں پروان چڑھی اور انہوں نے اپنے ملک کے غریب، لاچار اور مظلوم عوام کے رنج والم اور تکالیف کی آئینہ داری کی مگر حقیقی شاعری کی طرح اُن کی شاعری کسی ملک، خطے، ذات، قوم یا نسل تک محدود نہیں بلکہ اُن کی شاعری آفاقی ہے اور وہ دنیا کے تمام مظلوم افراد کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ پاکستان کے ہی نہیں تمام مظلوم اور ستائے ہوئے عوام کو ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے ہمت بندھاتے ہیں اور کہتے ہیں:

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

حصول آزادی کے بعد جب اکثر ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے ایمانداری اور غیر جانبداری کو تلانجلی دے دی تھی اور اپنے معمولی آرام و آسائش کی خاطر اپنے ظرف، ضمیر اور قلم تک کو گروی رکھ دیا تھا اور عوام کا ساتھ چھوڑ کر برسرِ اقتدار طبقہ کے ساتھ ہو گئے تھے، جالب اپنے منتہائے مقصود کی جانب ثابت قدمی سے رواں دواں رہے اور کچھ انعامات واعزازات اور آرام و آسائش کے حصول کے لئے اپنے اصولوں کو خیر باد کہہ کر بِک جانے والے بے ضمیر ادیبوں اور صحافیوں کو مخاطب کر کے بڑے دُکھ سے کہتے رہے:

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال

www.taemeernews.com

فکرِ تعمیرِ ملک دل سے نکال
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

اسی طرح سرمایہ داروں، مل مالکوں، افسروں، جاگیرداروں کی دھاندلیوں اور جبر و تشدد پر بھی وہ خاموش نہیں رہے اور انہیں للکار للکار کر تنبیہ کرتے رہے:

ملوں کے مالکو! اے افسرو! زمیندارو!
ہماری راہِ ترقی میں کالی دیوارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے بیمارو
یہ دَور اصل میں انسان کے وقار کا ہے

درحقیقت جالبؔ کی شاعری اُن کے عشقِ بشر اور ایماندارانہ احتجاجی رویے پر مبنی ہے۔ گو احتجاجی ادب لگ بھگ ہر زبان میں پایا جاتا ہے لیکن اُردو ادب میں بھی اس کی کمی نہیں لیکن جتنا احتجاج جالبؔ کی شاعری میں پایا جاتا ہے اُتنا اُردو کے کسی شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ اُن کی ابتدائی شاعری کا لہجہ دھیما ضرور ہے لیکن جوں جوں آمریت کا قہر و جبر بڑھتا گیا اور بے اصول سمجھوتوں کا دَور دورہ شروع ہو گیا، اُن کا احتجاج شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اسی طرح انسان سے اُن کا عشق اس معراج تک پہنچ گیا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ساری خدائی کا درد اُن کے دل میں سما گیا تھا اور وہ ساری عمر انسانی کرب میں تڑپتے رہے۔ مجبور و محکوم اور درماندہ افراد کے حق میں آواز بلند کرنا اُن کا شیوۂ زندگی بن گیا اور اس سے انہیں کوئی قہر و جبر بھی نہ روک سکا اور نہ قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں۔ انہیں اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ عشق ہر فرد کے بس کی بات نہیں، اُسے اختیار کرنا آگ کے دریا میں کودنا ہے اسلئے وہ اپنے ساتھیوں اور عوام کو خبردار کرتے ہیں کہ:

www.taemeernews.com

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو
چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دُور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو

جالبؔ کی غزلوں کو اُن کی نظموں کے مقابلے میں کم اہمیت دی گئی ہے حالانکہ اُن کی غزلوں کی غنائیت اور سلاست میں احتجاج اور تلخ کلامی کی آمیزش نے انہیں پُرکشش اور پُر تاثیر بنا دیا ہے جیسا کہ احمد ندیم قاسمی نے اُن کے پہلے شعری مجموعے ''برگِ آوارہ'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''حبیب جالب کی نظموں اور بعض غزلوں کے اِکا دُکا اشعار میں تلخی اور طیش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے ..... لیکن یہ اُن کے فن کا نقص نہیں، اس کے فنی خلوص کے احتجاج کا ہے اور جس فنکار کو احتجاج کا حوصلہ نہیں ہوتا، وہ خود فن کی بے حرمتی پر صرف آنکھیں جھپک کر رہ جاتا ہے۔''

جالبؔ کی غزلوں میں کلاسکیت بھی ہے اور جدیدیت بھی اور وہ اس امتزاج سے ایسے ایسے اشعار کی تخلیق کرتے ہیں جو ہم پر بے پناہ اور امٹ تاثر چھوڑتے ہیں اور جنہیں ہم بار بار دہراتے ہیں؛

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

☆

www.taemeernews.com

نگاہِ دہر میں ذرے سہی مگر ہم لوگ
ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے

☆

تعجب ہے ستم کی آندھیوں میں
چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

☆

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہوچکی
اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

☆

ہم سے پوچھو چمن پہ کیا گزری
ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

☆

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

☆

حسرت سی برستی ہے در و بام پر ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

☆

بِک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں

اس میں شک نہیں کہ اُردو ادب نے ماضی میں ہمیں کئی عظیم المرتبت شاعر

www.taemeernews.com

عطا کئے ہیں اور آئندہ بھی کئی بڑے شاعر ہمیں نصیب ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ حبیب جالب جیسے بے باک و دلیر شاعر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس میں تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حصولِ آزادی کے بعد برِصغیر کی کسی زبان میں اُن جیسا نڈر اور باضمیر شاعر شاید پیدا نہیں ہوا جس نے مظلوم اور مجبور عوام کے لئے اربابِ اقتدار سے ٹکر لی ہو اور اپنی زندگی کا طویل عرصہ قید و بند کی اذیتیں برداشت کرنے میں گزارا ہو۔ بلاشبہ وہ برِصغیر کے واحد شاعر تھے جنہوں نے اپنا قلم ہی نہیں اپنی زندگی بھی عوام کے لئے وقف کر دی تھی اور جو گفتار کے ہی نہیں بلکہ کردار کے بھی مردِ مجاہد تھے اور جنہیں آمروں اور جابروں کا قہر و ستم بھی اپنی منزلِ مقصود سے نہیں ہٹا سکا۔ وہ اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کے باوجود سچائی کے پرچم کو بلند کئے رہے، جنہوں نے کسی قیمت پر قلم اور ضمیر کا سودا نہیں کیا اور ہمیشہ یہ نعرۂ حق بلند کیا۔

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکرِ امنِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم
مَیں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

○○

www.taemeernews.com

اُستاد دامن

پیدائش: ۹ رفروری ۱۹۰۹ء لاہور (پنجاب)

وفات: ۳ ردسمبر ۱۹۸۴ء لاہور (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

پنجاب کا البیلا شاعر

اُستاد دامن

پنجاب میں جب تحریک آزادی زوروں پر تھی تو وہاں کے جلسے جلوسوں میں چند پنجابی شعراء کی آواز اکثر گونجا کرتی تھی اور ان ہی شعرا میں ایک اہم آواز تھی اُستاد دامن کی جن کا جنگِ آزادی میں بہت اہم حصہ تھا اور جن کی آواز کانگریس جلسوں میں عام طور پر سنائی دیتی تھی۔

اُستاد دامن کا نام تھا چراغ دین اور ان کی ولادت ۹ رفروری ۱۹۱۱ء کو پنجاب کی راجدھانی لاہور میں ہوئی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ درزی تھے اور مشہور تاریخی مغل یادگار شالیمار باغ کے قریب واقع کالونی باغبان پورہ میں ان کی دکان تھی لیکن اُن کا زیادہ تر وقت کانگریس کے جلسے جلوسوں اور لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کے پاس بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا لیکن افسوس کہ تقسیم کے بعد مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضا کاروں نے اُن کی دکان اور مکان کے ساتھ ساتھ اُن کی لائبریری کو بھی نذر آتش کر دیا۔ اس تباہی سے اُستاد دامن ٹوٹ سے گئے اور باغبان پورہ کو خیر باد کہہ کر بادشاہی مسجد کے برآمدے میں آکر مقیم ہو گئے۔ بعد ازاں انہوں نے بہت سی نظمیں تخلیق کیں لیکن انہیں 'باغیانہ' قرار دے کر کسی کو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں ملی۔

www.taemeernews.com

اُستاد دامن امن و آشتی اور ہندو مسلم بھائی چارے میں یقین رکھتے تھے اور برصغیر میں ہو رہے خون خرابہ سے وہ بے انتہا متفکر تھے اور وہ چاہتے تھے کہ لوگ درندگی کو چھوڑ کر انسانیت کو اپنائیں اور ایک دوسرے کو بھائی بھائی کی طرح محبت کریں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس دھرتی پر سینکڑوں پیغمبر آئے، نبی بھی بھیجے گئے، مہاتما بدھ نے بھی اس دھرتی پر امن اور انسان دوستی کی تبلیغ کی، رشی منی بھی آئے اور ہمارے اس دور میں مہاتما گاندھی ایسے سنت نے بھی جنم لیا اور سب نے ہمیں انسانیت کا درس دیا لیکن کیا یہ ہمارے لئے شرم کی بات نہیں کہ انسان پھر بھی درندے کا درندہ ہی رہا۔

وہ ایک سیکولر مزاج کے شاعر تھے اور وہ ہندو مسلم میں کوئی امتیاز و تفریق نہیں کرتے تھے اور اپنی شاعری میں بھی اسی کی تبلیغ کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا۔

منّاں مورتی، کعبے دے ول جھکنا رام اپنا، غیر رحمان وی ناہی
جدوں خیال آندا اوہدی بندگی دا رہندا ناہی ہندو مسلمان وی ناہی

(میں مورتی کو مانتا ہوں اور کعبے کی جانب سجدہ کرتا ہوں۔ رام اپنا ہے اور رحمان بھی غیر نہیں۔ جب اُس کی عبادت کا خیال آتا ہے تو نہ ہندو رہتا ہوں اور نہ مسلمان)

تقسیم سے انہیں انتہائی صدمہ پہنچا تھا کیونکہ وہ متحدہ ہندوستان کی آزادی کے حامی و مبلغ رہے تھے اور اس پر طرّہ یہ کہ ملک کی تقسیم بھی ایسی غیر قدرتی ہوئی تھی کہ پاکستان کو دو حصوں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں بانٹ دیا گیا تھا جن میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ اس غیر قدرتی تقسیم سے بھی وہ بہت متفکر ہوئے ور انہوں نے اپنے طنزیہ انداز میں کہا بھی تھا:

پاکستان دی عجب اے ونڈ ہوئی تھوڑا اس پاسے تھوڑا اُس پاسے
انہاں جراحاں نے کی علاج کرنا مرہم اس پاسے پھوڑا اُس پاسے
اساں منزل مقصود تے پہنچناں کی تانگہ اس پاسے گھوڑا اُس پاسے

(پاکستان کی عجیب تقسیم ہوئی ہے۔ تھوڑا اس طرف ہے تھوڑا اُس طرف۔ ان جراحوں (لیڈروں) نے ہمارا کیا علاج کرنا ہے کیونکہ مرہم اس طرف ہے اور پھوڑا اُس طرف۔ ہم منزل مقصود پر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ کیونکہ تانگہ اس طرف ہے اور گھوڑا اُس طرف)

www.taemeernews.com

برصغیر کی تقسیم کے بعد اُستاد دامن کو حکومتِ ہند نے لال قلعہ میں منعقد ہونے والے مشاعرہ جشن آزادی' میں بھی شرکت کے لئے دہلی مدعو کیا اور وہ کئی دن تک یہاں قیام پذیر رہے تھے۔ دہلی میں آباد لاکھوں پنجابیوں کی خواہش تھی کہ اُستاد دامن لاہور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر یہاں دہلی میں آباد ہو جائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا کیونکہ لاہور تو اُن کی جان تھا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا لیکن اُستاد نے اس تجویز کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ مَیں رہوں گا لاہور ہی میں چاہے وہاں مجھے جیل میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

لال قلعہ کے مشاعرے میں جب انہوں نے آزادی سے متعلق یہ نظم پڑھی تو سامعین کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

آزادی ہتھوں برباد یارو ہوئے تسی وی ہو، ہوئے اسی وی ہاں
لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے روئے تسی وی ہو روئے اسی وی ہاں
جاگن والیاں رج کے لٹیا اے سوئے تسی وہ ہو، سوئے اسی وی ہاں

(آزادی کے ہاتھوں آپ بھی برباد ہوئے ہیں اور ہم بھی۔ آنکھوں کی سرخی اس کا اظہار کر رہی ہے کہ روئے آپ بھی ہیں اور ہم بھی۔ پہریداروں نے ہمیں بُری طرح لوٹا کھسوٹا ہے اس لئے سوئے آپ بھی نہیں اور ہم بھی نہیں۔)

آزادی کے بعد بھی اُستاد نے اپنی عوامی سرگرمیاں بند نہیں کیں۔ جب ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو بھی وہ خاموش نہیں رہے اور انہوں نے بنا خوف و ہراس کہا:

میرے ملک دے دو خدا لا الہ تے مارشل لا
اِک رہندا عرشاں اُتے دوجا رہندا فرشاں اُتے
اوہدا ناں ہے اللہ میاں اوہدا ناں اے جنرل ضیا
واہ بھئی واہ جنرل ضیا کون کہندا تینوں اِتھوں جا

(میرے ملک میں دو خدا ہیں ایک لا الہ اور دوسرا مارشل لا۔ ۲۔ ایک تو عرش پر رہتا ہے اور دوسرا اس دھرتی پر۔ ۳۔ عرش والے خدا کا نام ہے اللہ میاں اور دھرتی والے کا جنرل ضیا۔ ۴۔ واہ بھئی جنرل ضیا واہ! کون کہتا ہے کہ تم یہاں سے جاؤ۔)

سارے ملک دیاں موجاں ہی موجاں جدھر دیکھو فوجاں ہی فوجاں

www.taemeernews.com

لکھاں بندے قیدی ہوکے ادھا دیندے ملک گنوا
واہ بھئی واہ جنرل ضیا کون کہے تینوں اتھوں جا

(سارے ملک کی موج ہی موج ہے۔ کیونکہ جدھر بھی دیکھو فوج ہی فوج ہے۔ لاکھوں افراد قیدی بن کر آدھا ملک گنوا بیٹھے ہیں۔ واہ بھئی جنرل ضیا واہ! کون کہتا ہے کہ تم یہاں سے جاؤ۔)

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب بابائے قوم مہاتما گاندھی کو شہید کیا گیا تو وہ اس پیغمبر انسانیت کی شہادت پر درد و غم سے چلا اُٹھے:

گولی ماری اے جس نے مہاتما نوں او ہنے زمین دا گولا گھمادِتا
چیخاں وچ آواز اک امن دی سی کسی ظالم نے گلا دبادتا

(جس بھی شخص نے گاندھی جی کو گولی ماری ہے، اُس نے کرۂ ارض کو گھما دیا ہے۔ اُن کی چیخوں میں بھی امن و آشتی کی آواز تھی جس کا کسی ظالم نے گلا دبا دیا ہے)

وہ آئے دن سرحد پر ہونے والے تصادموں سے بھی رنجیدہ تھے اور انہوں نے سرحد پر امن و امان کا پیغام ان الفاظ میں دیا تھا۔

واہگے نال اٹاری دی نئیں گیتا نال قرآن دی اے
نا ہیں کفر اسلام دا کوئی جھگڑا ساری گل اے نفع نقصان دی اے

(واہگہ کے ساتھ اٹاری کا کوئی تصادم نہیں اور نہ ہی گیتا اور قرآن کا۔ کفر و اسلام کا بھی کوئی جھگڑا نہیں بس سارا معاملہ نفع نقصان کا ہے)

اور اس طرح زندگی بھر عوام کے دکھ درد کی اپنی شاعری میں ترجمانی کرنے والی یہ مقبول عوام ہستی ۳؍دسمبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئی اور عوام اپنے اُس ہر دلعزیز شاعر سے محروم ہو گئے جس کی سیکولر آواز پنجاب کے مشاعروں اور جلسوں میں اکثر گونجا کرتی تھی اور جو آج بھی اپنی سیکولر اور شاعری کی بدولت ہمارے دلوں پر راج کر رہا ہے اور جس کی موت کے بعد بھی بقول شاعر یہی احساس ہوتا ہے کہ ؎

تنہا ترے ماتم میں نہیں شامِ سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

☆☆☆

www.taemeernews.com

دلیپ سنگھ

پیدائش: ۲؍جنوری ۱۹۳۲ء رام کا چٹھہ، گوجرانوالہ (پاکستان)

وفات: ۸؍اگست ۱۹۹۶ء دہلی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

دلیپ سنگھ

اپنی تحریروں کے آئینے میں

دنیائے ادب وفن میں بعض ہستیوں نے انتہائی قلیل عمر میں اپنی معرکتہ الآرا تخلیقات پیش کر کے ایسی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے کہ اُن کی عظمت واہمیت کا سکہ ہر کسی کے دل میں بیٹھ گیا۔ اوراُن کا نام اپنے میدانِ فن میں امر ہوکر رہ گیا۔ انگریزی کے شہرہ آفاق شاعر جان کیٹس کی وفات صرف ۲۶ سال کی عمر میں ہوئی تھی مگر اپنی قلیل ادبی زندگی میں اُس نے ایسی یادگار نظمیں پیش کیں کہ انگریزی ادب میں اُس کا نام لافانی ہوگیا۔ اوراس کا شمار انگریزی کے اہم شعراء میں ہونے لگا۔ اسی طرح جواں مرگ آرٹسٹ امرتا شیر گل کی وفات بھی عین عالمِ شباب میں ہوئی مگر اُس کے شاہپاروں نے اسے مصوری کی دنیا میں لافانی بنا دیا۔ گواس لحاظ سے دلیپ سنگھ کی عمرِ طبیعی قلیل نہیں تھی اوراُس نے لگ بھگ ۶۵ سال کی عمر پائی تھی لیکن جہاں تک اُس کی ادبی زندگی کا تعلق ہے وہ ایک دہائی سے کچھ ہی زیادہ مدت پر محیط ہے۔ پھر بھی اس مختصر ادبی زندگی کے باوجود اُس نے اُردو طنز ومزاح میں ایسا مقام حاصل کر لیا کہ مذکورہ صنف کی تاریخ اُس کے حوالہ کے بغیر نامکمل رہے گی۔

www.taemeernews.com

دلیپ سنگھ کا منفرد لہجہ اور بے تکلف انداز بیاں اُس کی کامیابی کی ایک اہم وجہ ہے۔ اُس نے دیگر مزاح نگاروں سے الگ تھلگ راستہ اپنایا اور جلد ہی اپنے انفرادی اسلوب سے اپنی الگ شناخت بنالی۔ وہ عام مزاح نگاروں کی طرح اپنے مضمون کی بنیاد صرف چٹکلوں اور لطیفوں پر نہیں رکھتا بلکہ وہ اُن میں زندگی کی سچائیوں، خوشیوں، تلخیوں اور غموں کی عکاسی کرتا ہے اور جان پڑتا ہے جیسے وہ دوسروں کے دکھوں کو اپنا درد سمجھتا ہے اور انہیں اپنا رنج و غم سمجھ کر ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔ وہ اس میں ہمیں اس طرح ملوث کر لیتا ہے کہ ہم اُس میں ڈوب کر اور کھو کر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی زندگی کے واقعات و حادثات کو یوں پیش کیا ہے جیسے اپنے دور کی تاریخ کی جھلکیاں پیش کر رہا ہو۔ یا اپنے سوانحی حالات سے ہمیں متعارف کرا رہا ہو۔ اور یہ واقعات اُس نے اتنے مزاحیہ اور دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں کہ قاری کو کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ اُس نے پنجاب کی مشترکہ تہذیب کی بھی کئی مقامات پر منظر کشی کی ہے اور جگہ جگہ اپنی نجی اور گاؤں کی زندگی کی عکاسی اس انداز سے کی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک 'پینڈو' ہے۔ علاوہ ازیں ان مضامین کے مطالعہ سے ہم اُس دور کے حالات ہی سے نہیں بلکہ اس کی زندگی کے ہر اہم حادثہ و واقعہ سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔

دلیپ سنگھ سے میری کبھی بھی گہری دوستی نہیں رہی لیکن چونکہ ہم دونوں کا دفتر ایک ہی بلڈنگ ''شاستری بھون'' میں واقع تھا لہذا کبھی کبھار ہم ایک دوسرے کے ہاں چلے جایا کرتے تھے اور کاریڈور میں تو اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دن وہ دوپہر کے وقت میرے کمرے میں آیا اور بولا کہ اُسے تھوڑے سے میٹر کی کتابت کرانی ہے کیونکہ اس کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے وہ کچھ مدت سے لکھ رہا ہے اور اب ایک آدھ برس سے

www.taemeernews.com

رسائل میں بھی مزاحیہ مضامین لکھ رہا ہے مگر یہ احساس نہ تھا کہ اُس نے تھوڑے سے عرصے میں اتنے مضامین لکھ لئے ہیں کہ مجموعہ مرتب ہو سکے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جن دنوں وہ ٹیلی ویژن کے لئے سیریل لکھ رہا تھا تو فکر تونسوی نے، جس سے اُس کی بڑی دوستی اور قربت تھی اُسے اخبارات و رسائل میں مزاحیہ مضامین لکھنے کی تحریک و ترغیب دی تھی۔ اور اُس نے پہلا مضمون ''معذرت نامہ'' لکھا جو ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مضمون کی دوستوں نے ہی نہیں بلکہ قارئین نے بھی دل کھول کر تعریف کی اور اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے وہ بڑی تیزی سے لکھنے لگا۔ اور بہت جلد اُس نے قارئین کے دلوں میں اپنی چھاپ جمادی حتیٰ کہ اسے جگہ جگہ سے محفلوں اور جلسوں میں پڑھنے کے لئے بلایا جانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ ملک سے باہر بھی کئی ممالک میں منعقد تقاریب میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔

دلیپ سنگھ کے مضامین کے دو مجموعے ''سارے جہاں کا درد'' اور ''گوشے میں قفس کے'' کے علاوہ سفرنامہ ''آوارگی کا آشنا'' بھی ادبی حلقوں میں بڑا پسند کیا گیا۔ پھر اس نے ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی میں ''تیری سرکار میں پہنچے'' قسط وار لکھنا شروع کیا جس میں اُس نے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران کے واقعات و حادثات کو بڑے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کیا۔ علاوہ ازیں اُس نے روزنامہ ''قومی آواز'' میں ''گل گفت'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم بھی لکھنا شروع کیا۔

دلیپ سنگھ کی ادبی زندگی ایک دہے سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن اس قلیل مدت میں اس نے بڑی تیزی سے لکھا اور لکھتا چلا گیا۔ اور ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہو اور وہ اپنی منزل کی جانب بے تحاشہ دوڑ رہا ہو۔ شاید اُسے احساس تھا کہ اُس نے بڑی عمر میں لکھنا شروع کیا ہے اور لکھنے کے لئے عمر کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دلیپ سنگھ کی ولادت مغربی پنجاب (حال پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں رام کے چٹھ میں ہوئی اور یہیں اُس نے چھوٹے سے اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ اس گاؤں کے بارے میں اُس نے اپنے مضمون ''سرداراہرکارہ'' میں یوں لکھا ہے:

''ہمارا گاؤں پنجاب کے گوجرانوالہ ضلع میں واقع تھا۔اس کی دھرتی سے اتنا دھان اُگتا تھا کہ رات کو اگر کسی سے روٹی مانگنے نکل پڑو تو مایوسی ہو۔ دھان اگانے کے لئے ڈھیروں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی ہمارے یہاں بہتات تھی۔ بارش بھی خوب ہوتی تھی اور گاؤں کے قریب ایک نہر بھی بہتی تھی جس کے کناروں میں وقتاً فوقتاً شگاف کر کے کھیت سیراب کئے جاسکتے تھے۔''

دلیپ سنگھ نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے سے پیشتر روٹی روزی کمانے کے لئے کئی پاپڑ بیلے حتیٰ کہ وہ پرائیویٹ کالجوں میں بھی پڑھاتا رہا۔اس کا انکشاف مجھ پر تب ہوا جب میں اپنے دفتر کے ساتھی شری بھلہ کے ساتھ لنچ کے دوران گھومنے جارہا تھا کہ شاستری بھون کے کاری ڈور میں دلیپ سنگھ سے ملاقات ہوگئی۔شری بھلہ نے بڑے احترام سے جھک کر اُس سے ہاتھ ملایا۔دلیپ سنگھ کے جانے کے بعد مَیں نے اس سے پوچھا کہ بھلہ جی آپ دلیپ سنگھ کو کیسے جانتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ کالج میں ہمارے پروفیسر تھے۔ مجھے یقین نہ آیا مگر بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی۔اس بارے میں مزاحیہ رنگ پیدا کر کے دلیپ سنگھ نے اس کی یوں توثیق کی ہے؟

''میری خواہش تھی کہ بی اے میں اتنے نمبر آئیں کہ ہیڈ ماسٹر دینا ناتھ کی روح باغ باغ ہوجائے چنانچہ میں نے سوچا کہ کیمپ کالج کے ساتھ کسی

www.taemeernews.com

پرائیویٹ کالج میں بھی داخلہ لے لوں۔ان دنوں وائی ایم سی اے میں ایک پرائیویٹ کالج چل رہا تھا جس کی بڑی شہرت تھی۔میں نے وہاں حاضری دی۔داخلے کے سلسلے میں پرنسپل سے ملنا ضروری تھا۔پرنسپل کو ملنے والے اس دن کئی لوگ تھے۔میری باری آئی تو مَیں نے جاتے ہی اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کے لئے کہا تھا کہ مَیں ادیب فاضل ہوں۔ پرنسپل نے کہا چلے گا۔مَیں پوری طرح اُن کی بات سمجھ تو نہ سکا لیکن خیال ہوا کہ فیس کی رعایت دی جا سکتی ہے۔انہوں نے چپراسی کو بُلا کر کہا کہ انہیں کلاس میں لے جاؤ۔مَیں کلاس میں پہنچا تو پتہ چلا کہ بی اے کی کلاس ہے اور اُردو کا پیریڈ ہے اور پرنسپل نے مجھے پڑھانے کے لئے بھیجا ہے..... اُردو سے اکنامکس اور انگریزی کی پروفیسری تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں کہ ہم ماہر ہو چکے تھے بولنے میں۔چالیس منٹ تک کسی بھی مضمون اور کسی بھی زبان میں بول سکتے تھے اور یہی پروفیسر کا کام ہوتا ہے.....

کافی ہاؤس سے میرا تعارف ۱۹۵۴ء کے آس پاس ہوا۔بی اے پاس کرنے کے بعد مَیں نے جب مقابلے کے امتحان میں قسمت آزمائی کا ارادہ کیا تو کسی نے مشورہ دیا کہ انٹرویو کی تیاری کرنے کے لئے موزوں ترین جگہ کافی ہاؤس ہے کہ وہاں پر ہر مسئلہ پر کُھل کر بحث ہوتی ہے۔اور ذہن کے دروازے کھلتے ہیں۔ان دنوں دلی میں ایک ہی کافی ہاؤس تھا اور وہ اس سڑک کی خاصی بڑی دکان تھی جسے آج کل جن پتھ کہا جاتا ہے۔کافی ہاؤس میں یوں تو کسی کے داخلے پر پابندی نہیں تھی لیکن عام طور پر وہاں وہی لوگ جاتے تھے جنہیں کافی ہاؤس کے کلچر سے محبت تھی۔ان

www.taemeernews.com

میں اخبار نویس ادیب، انشورنس ایجنٹ، پراپرٹی ڈیلرز اور دوسرے ایسے لوگ شامل تھے جن کے کام کرنے کے اوقات پر پابندی نہیں ہوتی.....

میں بھی بلونت گارگی کی طرح بہت سویرے کافی ہاؤس کا پھیرا لگایا کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مَیں ان دنوں دو تین پرائیویٹ کالجوں میں پڑھایا کرتا تھا۔ چونکہ یہ کالج کناٹ پلیس میں واقع تھے اس لئے پیریڈ کا درمیانی وقفہ گزارنے کے لئے کافی ہاؤس چلا جاتا تھا.....''

اپنے مضامین میں دلیپ سنگھ نے اپنے اکثر دوستوں کا ذکر بھی کیا ہے اور بعض کے خاکے بھی پیش کئے ہیں۔ ان میں سے ایک خاکہ بعنوان ''بیدی کا پودا'' نارنگ ساقی سے متعلق، جو اُن کے عزیز ترین دوست تھے، سپردِ قلم کیا ہے جس سے ان کی دوستی کے کئی پہلو منظرِ عام پر آتے ہیں۔

دلیپ سنگھ نے چونکہ اپنے مضامین میں اپنی نجی زندگی، اپنے گاؤں، اپنے اعزاء و اقارب کے بارے میں جا بجا لکھا ہے لہذا اگر ان تحریروں کو پڑھ کر کوئی اس کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے تو بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی کے بے شمار واقعات و حادثات ان تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

دیویندر اسر

پیدائش: ۱۴/اگست ۱۹۲۸ء، حسن ابدال (پنجہ صاحب) پاکستان

وفات: ۶/نومبر ۲۰۱۲ء، جنک پوری دہلی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ایک دانشور کی موت

ممتاز و نامور نقاد، دانشور اور فکشن نگار دیویندر اسر کچھ مدت سے شدید علیل تھے اور گھر پر اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی، اور جو بھی اُن سے ملنے جاتا تھا وہ اُن کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ آہ بھر کر رہ جاتا تھا مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ ہاں سوچتا ضرور تھا کہ ان کے لئے کچھ کیا جائے۔ اسی دوران ۲۷ر دسمبر ۲۰۱۱ء کو اُن کے ایک ہمدرد و پرستار ہمانشو شرما سے اُن کی بے بسی اور لاچاری دیکھی نہ گئی اور نیٹ ورک پر اُنہوں نے اسر صاحب کے رشتہ داروں دوستوں اور پڑوسیوں سے اپیل کی کہ وہ اُن کی مدد کریں۔ انہوں نے بڑے دُکھ اور افسوس کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ:

" One of the eminent award

www.taemeernews.com

winning-writer Devendra Issar, 84,is looking for help from the society at large after apathetic attitude of his sons rendered him to a stinky corner of his house in Janakpuri.

اس کے بعد ہمانشو شرما نے اسر صاحب کی اُردو اور ہندی میں کی گئی گراں قدر خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا تھا کہ:

"....Unfortunately ,he is not receiving due care from his sons.He has been kept in the servant room of the backyard of his house which he built with his own hard-earned money.He is now looking for help of his neighbours,friends,well-wishers and society at large.

اسر صاحب کی اس ناگفتہ بہ حالت سے ان کے سبھی جانکار اور احباب اچھی طرح واقف تھے اور اُن کی نجی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے تھے کہ وہ

www.taemeernews.com

اپنی بیوی سے طلاق کے بعد اپنے کئی کمروں پر مشتمل لگ بھگ دوسو گز مکان میں صرف ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تنہائی اور بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور بقیہ سارے مکان پر ان کے بیٹوں کا قبضہ ہے جو ہر آنے جانے والے پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ گو اِسر صاحب نے اپنی پریشانی اور لاچاری کے بارے میں سوائے چند قریبی دوستوں کے کسی سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا تاہم اس بارے میں ان کے سبھی احباب اور جانکار متفکر رہتے تھے لہذا ایک بار اُن کے کسی دوست نے بڑی ہمت کر کے اُن سے پوچھا تھا کہ آپ کے ان تشویشناک حالات کے کارن آپ کو آخری وقت میں بہت پریشانی ہوگی۔ تو انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ ''آخری وقت ..... میرے مرنے کے بعد میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ اول تو میرے رشتہ دار مجھے ٹھکانے لگا دیں گے۔ اگر وہ نہیں لگائیں گے تو جب میرے کمرے میں سڑاند پیدا ہوگی تو محلے والے میرا انتم سنسکار کر دیں گے اور اگر بالفرض وہ بھی تیار نہ ہوئے تو میونسپل کارپوریشن والے اس کام کو سرانجام دے دیں گے۔ لہذا یہ میرا مسئلہ نہیں سماج کا مسئلہ ہے۔''

لیکن کسے معلوم تھا کہ اُن کی وفات پر اس کی اطلاع اُن کی اکلوتی بہن، ماموں، خالہ زاد اور ماموں زاد بھائیوں تک کو نہیں دی جائے گی اور بغیر کسی قریبی رشتہ دار یا اُن کے قریبی دوستوں کو بتائے، ان کا پُر اسرا حالت میں انتم سنسکار کر دیا جائے گا۔ اور کسی کو خبر تک نہیں دی جائے گی۔ کیوں آخر کیوں؟

اگر مَیں ۲۰ رنومبر کو اُن کی عیادت کے لئے نہ گیا ہوتا تو شاید مہینوں تک ادبی دنیا کے ایک نامور شخصیت کی موت کے بارے میں لوگوں کو پتہ تک نہ چلتا جس نے

www.taemeernews.com

اور فکشن کے میدان میں بڑی شہرت پائی تھی اور جس کے افسانوں کے مجموعے ''گیت اور انگارے''، ''شیشوں کا مسیحا''، کینوس کا صحرا'' اور ''پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے'' .....ناولٹ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے''.....اور تنقیدی کتابوں ''فکر اور ادب''، ''ادب اور نفسیات، ''ادب اور جدید ذہن، ''مستقبل کے روبرو''، ''ادب کی آبرو'' اور۔ ''نئی صدی اور ادب'' کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی اور جنہیں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو اُردو میں متعارف کرانے والوں میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اُن کی ادبی حیثیت کے بارے میں معروف نقاد اور فکشن نگار سلیم اختر صاحب نے تحریر کیا تھا:

> ''دیویندر اسر نئی نسل کے ذہین ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نفسیات کے ساتھ وجودیت، سررئیلزم، اور دیگر جدید ترین ادبی اور فکری تحریکوں سے بھی گہری واقفیت ہے.....اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو اس کی افادیت ثابت کرنے یا خامیاں گنوانے تک خود کو محدود نہ رکھا بلکہ جدید ادب اور جدید ذہن کو نفسیات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔''

اسی طرح ممتاز محقق وقار عظیم صاحب نے اپنی تحقیقی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' میں ان کی افسانوں کے بارے میں یوں رائے زنی کی:

> ''دیویندر اسر ہمارے اُن گنتی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کی تلخیوں اور اس کے انتشار و

www.taemeernews.com

اضطراب سے گھبرا کر تصور اور تخیل کی دنیا میں پناہ لینے کی کوشش نہیں کی ۔انہوں نے اس انتشار اور اضطراب کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا ہے۔اُن کی نظر زندگی کی چھوٹی چھوٹی برائیوں پر بھی ہے۔لیکن اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ بُرائیاں پورے نظام کو بدلے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔''

مَیں سروس لین کی جانب سے جا کر اِسر صاحب کے دروازے کی گھنٹی بجاتا ہوں تو گھنٹی نہیں بجتی ۔لیکن بجتی بھی کیسے جب کہ اس کے تار نکال دئے گئے تھے یا اُسے خراب کر دیا گیا تھا تا کہ کوئی اِسر صاحب سے مل نہ سکے۔پھر مَیں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر نہ کوئی آواز آئی اور نہ کسی نے دروازہ کھولا۔مجبوراً میں سامنے والے مین گیٹ پر پہنچا اور گیٹ کھٹکھٹایا کیونکہ گیٹ پر گھنٹی نہیں تھی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید اندر والوں کا خیال تھا کہ مَیں دروازہ کھٹکھٹا کر چلا جاؤں گا۔لیکن مجھے خدشہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔مَیں پھر عقبی جانب پہنچ کر دروازہ زور زور سے پیٹتا ہوں تو اندر سے اُن کے بیٹے کی آواز آتی ہے۔

''کون ہے؟''

مجھے معلوم ہو گیا یہ اُن کے بڑے بیٹے کی آواز ہے۔تب مَیں نے کہا ''مَیں ہوں بیٹا، ذرا دروازہ کھولو''

www.taemeernews.com

''دوسری طرف سے آؤ۔''

مَیں ان کے مین گیٹ پر پہنچ جاتا ہوں جہاں تالہ لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اُن کا بڑا بیٹا باہر نکلتا ہے۔ اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور پھر سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کرتا ہے۔ ''کیا ہے؟''

مَیں نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ ذرا گیٹ کھولو؟''

''کیوں؟''

مَیں جانتا تھا وہ تالہ کھولنا نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ مَیں واپس چلا جاؤں۔ مگر میں اتنی دُور سے آنے کی وجہ سے چاہتا تھا کہ اسر صاحب کو ایک نظر دیکھ لوں۔ مَیں چند ثانئے تو سوچ میں پڑ گیا پھر بڑا حوصلہ کر کے کہا ''مَیں اِسر صاحب کو دیکھنا چاہتا ہوں''

اُس نے دروازہ نہیں کھولا اور اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا۔ ''اُن کی تو وفات ہو چکی ہے؟''

مجھے بجلی کا کرنٹ سا لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھ پہ گولی داغ دی ہو۔ میں حیران و پریشان اس کی صورت دیکھنے لگا کہ وہ شخص جس سے میرا بھائیوں کی طرح رشتہ تھا۔ مجھے اُس کی موت کی خبر تک نہیں دی گئی۔ مَیں اندر سے غصے سے کھول اُٹھتا ہوں، مگر پھر بھی بڑے صبر و تحمل سے سوال کرتا ہوں:

''کب؟''

''۶ رنومبر کو''

مگر تم نے اطلاع کیوں نہیں دی؟

www.taemeernews.com

''کیوں اطلاع دیتا۔ آپ کیا ہمارے رشتہ دار ہیں۔'' اُس نے کرختگی سے جواب دیا۔

اب میں اُسے کیا جواب دیتا کہ میرا اِسر صاحب سے کیا رشتہ ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ مَیں ان کا ہمزاد ہوں حالانکہ وہ ۱۴ر اگست ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے تھے اور میں ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو۔

ہماری پہلی ملاقات آج سے کوئی ستر سال پیشتر راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ اور پھر ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ساتھ ہوگیا۔ اِسر صاحب کے بڑے بھائی مہندر اِسر اور میرے ماموں نے تقسیم سے چند سال پیشتر راولپنڈی میں ''وپلو آیورویدک فارمیسی'' قائم کر کے آیورویدک دوائیاں بنانے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اور جب بٹوارے کے بعد مجبوراً انہیں ہجرت کر کے پاکستان سے کانپور آنا پڑا تو وہاں انہوں نے مشترکہ طور پر چونے کے بھٹے کا کاروبار شروع کیا اور کچھ مدت تک دونوں پریوار ایک ہی مکان میں رہتے رہے۔ پھر اِسر صاحب کا پریوار قریب ہی ایک دوسرے کرائے کے مکان میں منتقل ہوگیا اور دن میں پریوار کے لوگ کئی کئی بار ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ کبھی مَیں اِسر صاحب کے گھر چلا جاتا اور کبھی وہ ہمارے گھر آجاتے۔ شام کو ہم مول گنج چلے جاتے جہاں سرشار صدیقی، نامی انصاری وغیرہ کئی دوستوں کے ساتھ گپ شپ ہوتی۔ ان دنوں ہمارے پاس ایک ہی سائیکل تھی جو اِسر صاحب کی ملکیت تھی جسے ہم باری باری چلایا کرتے تھے۔ اگر جاتی بار وہ چلاتے تھے تو واپسی پر یہ فریضہ میرا ہوتا تھا۔ اسی سائیکل کو کانپور اسٹیشن کے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑا کر کے ہم پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لکھنو بھی گئے تھے اور گھر والوں کو پتہ تک نہ چلا۔ انہیں تو

www.taemeernews.com

تب پتہ چلا جب یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو اسر صاحب گرفتار ہو گئے تو سی آئی ڈی والوں نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ لکھنؤ میں کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے جایا کرتے تھے۔ ورنہ انہیں گمان تک نہ تھا کہ ہماری پوشیدہ سرگرمیاں بھی ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے رہے کہ ہم معمول کی طرح کسی کام سے باہر گئے ہیں۔

کانپور میں قیام کے دوران ہم نے ''ارتقاء'' نامی ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ نومبر دسمبر کی شدید سردی میں ہم کھلی چھت پر بیٹھے بارہ ایک بجے تک اس کی پیکنگ اور پتے لکھنے میں مصروف رہے تھے اور سردی کے باجود ہم اتنے خوش تھے کہ ہمیں سردی کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

کانپور میں ہی ایک بار پارٹی نے ہمیں ہدایت دی کہ ہمیں ایک روپوش کامریڈ کو رات نو بجے حلیم مسلم کالج سے کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ ایک کامریڈ نے ہمیں دن کو مذکورہ جگہ دکھا دی تا کہ ہمیں رات کو ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔ پھر رات نو بجے ہم حلیم کالج پہنچے اور وہاں سے ہم نے ایک بڑے بڑے منتشر بالوں والے پریشان حال نوجوان کو اپنے ساتھ لیا اور چمن گنج سے ایک رکشا میں اس نوجوان کو بیچ میں بٹھا کر ہم تینوں اس مکان پر پہنچے جہاں اسے قیام کرنا تھا۔ جب وہ نوجوان مکان کے اندر چلا گیا تو ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان کامریڈ مونس رضا تھے جو بعد ازاں دہلی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

اِسر صاحب کی موت کی خبر نے مجھے اندر تک سے ہلا دیا۔ گھر آ کر مَیں نے کسی دوست کو خبر سنانے سے پہلے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھا تا کہ بعد ازاں غلط نکلنے پر مجھے پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پہلے مَیں نے اُن کے ماموں صاحب سے

www.taemeernews.com

ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ چند دن پیشتر دہرہ دون سے اسر صاحب کی بہن کملیش نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ان کی وفات ہوگئی ہے۔۔تب میں نے دہرہ دون کملیش سے بات کی تو اُس نے بتایا کہ اُسے دس دن بعد ۱۵ نومبر کو معلوم ہوا تھا کہ بھائی صاحب کی مرتیو ہوگئی ہے۔وہ بھی یوں کہ جب کئی بار فون کرنے پر اُن سے رابطہ قائم نہ ہوسکا تو مَیں نے اُن کے بیٹے سے موبائیل پر بات کی تو اُس نے بتایا کہ ان کی تو ۶ رنومبر کو وفات ہوچکی ہے۔اس پر میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی تو اُس نے جواب دیا کہ آپ کو کیوں بتاتے آپ کا ہمارے ساتھ کیا رشتہ ہے؟'

فون پر یہ بات سُن کر مَیں غم وغصہ سے پاگل سے ہو اُٹھا کہ جو شخص اپنی پھوپھی سے اپنا کوئی رشتہ نہیں مانتا وہ بھلا میرے رشتے کو کیا سمجھے گا، کیونکہ میرا اُن سے وہ رشتہ تھا جو کسی اور کا نہیں تھا۔اُن کے ہر کام میں مَیں شریک رہا۔وہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے مَیں اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب انہیں حکومتِ پنجاب کا شرومنی اعزاز ملا تو بھی وہ اپنے ساتھ مجھے ہی لے کر گئے تھے نہ کہ اپنے کسی بیٹے کو۔مگر میرا اُن کے ساتھ کیا رشتہ تھا وہ نہیں سمجھ سکیں گے۔حالانکہ خود اِسر صاحب نے میرے اور اپنے رشتے کے بارے میں لکھا تھا کہ:

''نند کشور وکرم میرے گہرے اور عزیز ترین دوست ہیں اور ہمراز بھی ۔ اور یہ دوستی ساٹھ برسوں پر محیط ہے حالانکہ ہماری عمروں میں محض ایک سال کا فرق ہے لیکن مَیں انہیں اپنا عزیز ہی سمجھتا ہوں۔میری پیدائش ۱۴ر اگست

www.taemeernews.com

۱۹۲۸ء کو کیمبلپور حال اٹک شہر میں ہوئی تھی اور اُن کی ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو راولپنڈی میں جو میرے شہر سے پچپن میل کی دوری پر تھا.....

ہم نے اپنی کاروباری زندگی ایک ہی وقت ایک ساتھ شروع کی تھی۔ کانپور میں ہم نے ''ارتقاء'' پرچہ مشترک طور پر نکالا تھا جو بند کرنا پڑا۔ میرے بھائی صاحب کی وفات ہوئی تو ہم ''استھی پرواہ کے لئے اکٹھے ہردوار گئے۔ وہاں اُن کے جاننے والے پنڈے کے گھر رات رُکے۔ اُس رات مجھ پر دمے کا بڑا شدید دَورہ پڑا جس کا مَیں تقسیم کے بعد نقلِ مکانی کے دوران شکار ہوگیا تھا۔ وہ رات یا تو کیمسٹ کی تلاش میں گھومتے رہے یا میری تیمارداری کرتے رہے۔ اور ایک پل بھی نہیں سوئے۔ دلی میں جب مجھے گھر چھوڑنا پڑا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کپڑے نہ چائے کے برتن اور نہ پیسے۔ لیکن یہ وکرم صاحب ہی تھے جنہوں نے مجھے سہارا دیا اور سب کچھ مہیا کرانے میں میری مدد کی۔ اُس روز بارش ٹوٹ کر پڑ رہی تھی اور مَیں اُن کے اسکوٹر پر بیٹھا شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا''

(نند کشور وکرم از دیویندر اسر سہ ماہی اردو ادب، نئی دہلی)

کبھی ایک زمانہ تھا جب ہم ہر ہفتہ موہن سنگھ پیلس کے کافی ہاؤس میں شام

www.taemeernews.com

کوملا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ پھر کچھ عمر کے تقاضہ نے اور کچھ ہمارے گھروں میں فون لگ جانے سے یہ سلسلہ دھیرے دھیرے کم ہوگیا۔ اب ہم مہینوں بعد کافی ہاؤس یا شری رام سینٹر ملتے تھے۔ آخری بار کوئی ڈیڑھ سال پہلے ہم کافی ہوم میں دن کے وقت ملے تھے تو مَیں نے اندازہ کرلیا کہ اب ان سے صرف گھر پر ہی جا کر ملاقات ہو سکے گی کیونکہ اب ان کا آنا جانا دشوار ہوگیا تھا۔ خود انہوں نے بتایا کہ وہ کافی ہاؤس کا راستہ بھول گئے تھے اور بڑی مشکل سے پہنچے ہیں اور ضعف کے کارن ان سے چلا بھی نہیں جاتا۔ واپسی پر مَیں نے انہیں تھری ویلر پر بٹھایا اور کچھ راستہ اُن کے ساتھ بھی گیا۔ پھر مَیں نے اسکوٹر کے ڈرائیور کو جو ایک ادھیڑ عمر سردار جی تھے ہدایت دی کہ سردار جی انہیں آپ گھر کے اندر تک چھوڑ کر آیئے گا کیونکہ یہ بہت کمزور ہیں اور انہیں چلنے میں دشواری ہو رہی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مزید کمزور ہوتے گئے۔ اور ایک بار تو وہ گر بھی گئے تھے اور انہیں چلنے میں مزید دقت ہونے لگی تھی۔ اب میں اُن سے ٹیلی فون پر بات کر لیتا تھا لیکن وہ گفتگو میں بھی زیادہ Response نہیں دیتے تھے اور مجھے ان کی صحت کے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی کیونکہ ان کی یادداشت بھی تھوڑی کمزور ہوگئی تھی۔ ان کی اس حالت سے مَیں ہی نہیں ان کے دوسرے قریبی دوست بھی متفکر رہتے تھے اور فون پر اُن کی خیر و عافیت پوچھتے رہتے تھے۔

پھر ایک دن ہمارے ایک مشترکہ دوست راجیو شریواستو صاحب کا فون آیا کہ آپ جنک پوری آ جایئے کیونکہ اِسر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرایا جائے۔ مَیں فوراً تیار ہو کر جنک

www.taemeernews.com

پوری پہنچا، جہاں راجیو مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے اور میرے کال بیل بجانے پر انہوں نے ہی دروازہ کھولا۔ ابھی مجھے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسر صاحب کا چھوٹا بیٹا آکر بڑے غصے سے راجیو پر چلانے لگا کہ' آپ گھنٹی بجنے پر دروزہ، کیوں کھولتے ہیں۔ ہماری بلی باہر نکل جاتی تو؟' اور پھر ہمیں مخاطب کر کے بڑے زور سے چلا کر کہنے لگا۔' ہم اِن کا علاج کرا رہے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ لے جانا چاہتے ہیں تو لے جایئے۔' اس کے بولنے کے انداز سے ہمیں احساس ہوگیا کہ یہ نہیں چاہتا کہ ہم انہیں لے جا کر علاج کے لئے نرسنگ ہوم میں داخل کرائیں۔ تب مَیں نے راجیو سے کہا کہ.....' راجیو جی! بہتر ہے کہ ہم انہیں نرسنگ ہوم میں داخل کرانے نہ لے جا ئیں۔ کیونکہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو یہ ہم پر الزام لگا کر کچھ بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ہم اسر صا حب کے جتنے بھی قریب ہوں، ان کے بیٹوں کی مرضی کے بغیر ہمیں کوئی حق حاصل نہیں۔ اور انہیں قانونی حق حاصل ہے۔ لہذا ہم اسر صاحب کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے آئے اس کے کچھ دن بعد اُن کا فون بھی منقطع کر دیا گیا تا کہ باہر کا کوئی شخص اُن سے کوئی رابطہ قائم نہ کر سکے۔ اور اب جب مہینوں بعد ان کے گھر پہنچا تو اچانک پتہ چلتا ہے کہ آج سے پندرہ دن پیشتر وہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

اُن کی ازدواجی زندگی کی کہانی بہت ہی تکلیف دہ تھی اور اس سے ان کے سبھی جانکار واقف ہیں۔ جن دنوں ان کا وِمل (منکوحہ بیوی) سے معاشقہ چل رہا تھا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں بتایا کہ وہ اس سے شادی کر رہے ہیں اور وہ اس کے ساتھ مجھے ملنے کے لئے برلا مندر کے پاس پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم کے شعبے میں بھی آئے تھے جہاں میں جرنلزم کی کلاسیں اٹینڈ کرتا تھا۔ مگر گھر والے اس شادی

www.taemeernews.com

سے زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ وہ ایک غیر برادری کی لڑکی تھی اور ان دنوں غیر برادری میں شادی کرنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ بہرحال اُن کی شادی ہوگئی اور اُن کے دو بیٹے ہوئے اور وہ ایسٹ پٹیل نگر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگے..... پھر حالات نے ایسا پلٹا مارا کہ انہیں رات کے نو بجے گھر پہنچنے پر گھر میں گھسنے نہیں دیا گیا اور چانک وہ گھر سے بے گھر ہوکر رہ گئے۔

اس واقعہ کو انہوں نے اپنی آخری کہانی ''مسٹر روشو'' میں بھی جو کہ ان کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے یوں بیان کیا ہے کہ:

> ''اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے تھے۔ رات کے قریب نو بجے تھے۔ ریڈیو پر خبریں سنائی جارہی تھی۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ لفظوں کے اندر آواز تھی۔ جس عورت کے ساتھ شام گزار کے آرہے ہو، واپس اُس کے پاس چلے جاؤ، مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ یہ اُن کا دستور نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ اُس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا رکھتے تھے کہ نہ جانے وہ کب کسی ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے۔ ایک بجے، دو بجے، تین بجے، پو پھٹنے کے وقت..... اور اسے دستک نہ دینی پڑے، دروازہ بند نہ ملے مسٹر روشو ہولے ہولے بغیر چاپ کئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک

www.taemeernews.com

پر آ گئے۔''

بلاشہ'' مسٹر روشو'' ان کی اپنی زندگی کے کئی واقعات پر مبنی کہانی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات بیان کئے ہیں جیسے کالج کے زمانے میں ان کا کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونا..... شہید بھگت سنگھ سے متاثر ہوکر انقلابی بن جانا اور اورتحریک آزادی میں حصہ لینا اور جلسے جلوسوں میں شامل ہونا۔ ''مسٹر روشو'' میں انہوں نے یہی واقعات یوں قلم کئے ہیں:

''اسٹالن گراڈ، پر حملہ ہوا تو ریڈ آرمی بنالی۔ اگست انقلاب ہوا تو دیواروں پر عبارت لکھ دی۔ انگریزو ہندوستان چھوڑو..... بنگال کا قحط پڑا تو گلی کوچوں میں بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، گاتے ہوئے کپڑے لتے، آٹا چاول جمع کرنے لگا۔ جب شہر کی فضا بگڑنے لگی تو اُس نے طالب علموں کا جلوس نکالا۔'امن مارچ' شہر میں اس سے بڑا جلوس پہلی کبھی نہیں نکلا تھا اور لوگوں نے اس طرح ایک ساتھ مارچ نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی نہیں جب شہر کی سڑکوں پر ہجوم اُبل پڑا تھا۔ لال قلعے سے آئی آواز۔ ڈھلوں سہگل شاہنواز' کچہری کے پاس پولیس نے جلوس کو روک دیا۔ روشو اور اُس کے ساتھ دو اور طالب علموں کو حراست میں لے لیا گیا''

گھر سے نکالے جانے کے بعد وہ رات انہوں نے کہاں گزاری مجھے

www.taemeernews.com

یادنہیں شاید جنک پوری چلے گئے ہوں جہاں اُن کا مکان زیر تعمیر تھا اور جہاں اُن کے والد قیام پذیر تھے۔تاہم دوسرے دن شام کو وہ اپنے دفتر سے سیدھے میرے دفتر پٹیالہ ہاؤس آئے اور مجھے ساری روداد سنائی۔تب ہم ملٹری کینٹین گئے اور وہاں سے ہم نے کچھ بنیانیں، انڈرویئر تولیہ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ خریدے اور پھر جنک پوری والے مکان میں آ گئے جہاں ان کے والد قیام پذیر تھے۔ کچھ مہینے وہ لوگ الگ الگ رہے اس اثنا میں اسر صاحب کے والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی بیوی بھی اس موقع پر جنک پوری آئی تو اسر صاحب کے کسی رشتہ دار نے دونوں میں سمجھوتہ کرادیا اور وہ ایسٹ پٹیل نگر سے جنک پوری منتقل ہوگئی۔لیکن دونوں میں جھگڑے، تکرار اور کشمکش کا سلسلہ جاری رہا .....اسی اثنا ایک دن وہ ہمارے گھر آئے تو ان کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔میری بیوی نے پوچھا' بھائی صاحب !یہ کیا ہوا ہے؟' تو انہوں نے جواب دیا' میڈم نے گلر مارا ہے'۔بعد ازاں حالات اتنے خراب ہوگئے کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔طلاق کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی تھی کہ ان کی بیوی ان کی زدوکوب کرتی ہے۔اس پر جج نے کہا تھا کہ یہ عجیب کیس ہے جس میں کسی مرد کی پٹائی کی گئی ہے ورنہ اکثر عورتیں ہی اس طرح کی شکایت کرتی ہیں۔

طلاق کے بعد ان کی مطلوقہ بیوی تو کہیں اور رہنے لگی مگر بیٹے وہیں رہنے لگے جو ہر وقت آنے جانے والے پر نظر رکھتے تھے۔اور جب مَیں بیس نومبر کو اِسر صاحب کی عیادت کے لئے گیا تو پتہ چلا کہ پندرہ دن پیشتر وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اُن کے کسی رشتہ دار کو مطلع نہیں کیا گیا تھا کہ ان کی سگی

www.taemeernews.com

بہن کو بھی نہیں۔کیسی عجیب وغریب اور پُراسرا موت تھی یہ، جس میں ان کے کسی رشتہ دار تک کو مطلع نہیں کیا گیا اور چپ چاپ ان کا انتم سنسکار کر دیا گیا۔کیسی عجیب بات ہے؟

دیویندر اسر کے اکثر مضامین اور افسانوں میں سوالیہ نشان ہوتے تھے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ موت کے بعد وہ خود بھی ایک سوالیہ نشان بن جائیں گے۔ اور اپنے احباب و اعزاء کے دل و دماغ میں بھی سوالیہ نشان چھوڑ جائیں گے۔معلوم نہیں اُن کی وفات ہسپتال میں ہوئی یا گھر پر؟۔کون کون اُس وقت اُن کے پاس موجود تھا؟ کس شمشان گھاٹ پر انہیں نذرِ آتش کیا گیا وراس میں کون کون شامل ہوا؟ ہر بات صیغہ راز میں ہے اور حقیقت شاید اُن کی مطلوقہ بیوی یا اُس کے دو بیٹے ہی جانتے ہیں۔

کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟ عجیب تذبذب میں ہوں۔طویل عمری کا ایک المیہ یہ بھی کہ آپ اپنے بہت سے عزیز احباب واقربا کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور انہیں سپردِ لحد کرنے یا نذرآتش کرنے کا صدمہ بھی جھیلتے ہیں اور اُن کے آخری سفر پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔مگر مَیں نے تو اپنے بھائی جیسے عزیز ترین دوست کا انتم سنسکار بھی نہیں دیکھا۔کوئی بھی عینی شاہد نہیں ملا جو کہے کہ میں ان کے داہ سنسکار میں شامل ہوا ہوں۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شخص کو قتل کر کے بغیر اس کے اعزاء واقارب کو اطلاع دئے اسے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔اسر صاحب زندگی بھر اپنی تحریروں میں سوال کھڑے کرتے رہے اور اب ان کی موت نے

www.taemeernews.com

بھی کئی سوال کھڑے کر دیئے ہیں اور سبھی کو حیرت و استعجاب کے بحرِ عمیق میں غرقاب کر دیا ہے۔ میرا تو بہت ہی قریبی ساتھی ہمیشہ ہمشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا ہے جسے بھولنا ممکن نہیں اور ان کی وفات سے بڑی شدت سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ:

ہم زباں چُپ ہو گئے ہم داستاں چُپ ہو گئے
کیسے کیسے محفل آرا ناگہاں چُپ ہو گئے

☆☆☆

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

دیویندر ستیارتھی

پیدائش: ۲۸ رمئی ۱۹۰۸ء بھدوڑ، ضلع سنگرور (پنجاب)

وفات: ۱۲ رفروری ۲۰۰۳ء، دہلی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

دیویندر ستیارتھی

ایک قلندر.....ایک ملنگ

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب مَیں نے ہوش سنبھالا تو اُس دور میں دیویندر ستیارتھی لوک گیتوں اور کہانی نویسی کی بدولت ادبی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کر چکے تھے۔اُن دنوں ہمارے راولپنڈی شہر کے بازار تلواڑاں میں کتابوں کی ایک دکان تھی ''موجی بک اسٹال'' جہاں نہ صرف اُردو کتابیں اور رسائل فروخت ہوتے تھے بلکہ پڑھنے کے لئے کرائے پر بھی دستیاب ہوتے تھے۔اُس دکان پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا جس میں دائیں جانب گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور اور بائیں جانب ستیارتھی جی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔دونوں کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں۔بس فرق صرف اتنا تھا کہ جہاں گورودیو کی داڑھی بالکل سفید تھی وہاں ستیارتھی جی کی بالکل سیاہ۔تب تک مَیں ستیارتھی جی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ پنجاب کے مشہور افسانہ نگار دیویندر ستیارتھی ہیں جن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بیس برس تک ہندوستان بھر میں گھوم گھوم کر مختلف صوبوں اور علاقوں کے لوک گیت جمع کئے ہیں اور ان کے اس غیر معمولی کام کی گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور ایسی شخصیات نے بھی بڑی تعریف کی ہے۔

www.taemeernews.com

اُن کے بارے میں یہ سب جان کر دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں کبھی ان کے دیدار کر سکوں۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ تقسیم کا طوفان شہروں اور آبادیوں کو اُکھاڑ کر وہاں کے لاکھوں افراد کو اپنے آبائی شہروں کو خیر باد کہہ خوف و ہراس میں بہ عالم مجبوری کسی اور مقام پر آسرا ڈھونڈنے پر مجبور کر دے گا۔ اسی بٹوارے کے کارن جب ہم دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور کچھ مدت بعد ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو کئی بار ستیارتھی جی سے ملاقات ہوئی کبھی آج کل کے دفتر میں، کبھی کافی ہاؤس میں اور کبھی اُن کی روہتک روڈ قرول باغ میں واقع رہائش گاہ پر۔ اور ان تمام ملاقاتوں میں مَیں نے اندازہ لگایا کہ ستیارتھی جی ایک مشہور و معروف ہستی ہونے کے باوجود ایک ملنگ..... ایک قلندر قسم کے انسان ہیں جن کی داستان زندگی کسی الف لیلوی داستان سے کم نہیں۔

مشرق پنجاب کے ضلع سنگرور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے بھدوڑ۔ یہیں پر ۲۸ رمئی ۱۹۰۸ء کو ستیارتھی جی کا جنم ہوا اور ماں باپ نے شروع میں اُن کا نام یدھشٹر رکھا مگر بعد ازاں اسے بدل کر دیونیدر بتہ رکر دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ مڈل کا امتحان پاس کر کے موگا کے متھر اداس ہائی اسکول میں نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ ان ہی دنوں انہیں گورو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب ''گیتا نجلی'' پڑھنے کا موقع ملا جس کے مطالعہ سے وہ صرف متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ اُن کے ذہن میں یہ خیال گھر کر گیا کہ اگر گیتا نجلی پر نوبل انعام مل سکتا ہے تو ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے لوک گیتوں کو یکجا کرنے پر کیوں نہیں؟

پھر ۱۹۲۵ء میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور آگئے اور وہاں ڈی اے وی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی دوران لاہور میں آریہ سماج کی سلور جوبلی کے موقع پر انہوں نے پہلی بار گاندھی جی کو دیکھا اور اُن کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔

وہ کوئی ڈیڑھ سال تک ڈی اے وی کالج لاہور میں بھی تعلیم پاتے رہے لیکن پھر اسی دوران اُن پر مایوسی اور نا امیدی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ زندگی سے بیزار

www.taemeernews.com

ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس مایوسی کے دَور میں اگر علامہ اقبال نے انہیں سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو ممکن تھا کہ انہوں نے لاہور کے نیلا گنبد کے چوک میں خودکشی کر لی ہوتی۔ علامہ اقبال کے سمجھانے بجھانے کا اُن پر مثبت اثر ہوا۔ اُن میں جینے اور جدوجہد کرنے کا جوش وولولہ پیدا ہوا اور پھر اُن میں ملک کے کونے کونے میں گھوم کر لوک گیت جمع کرنے کی دیرینہ خواہش جاگ اُٹھی اور اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ملنگوں کی طرح گھر بار چھوڑ کر لوک گیتوں کی تلاش میں ایک لمبے سفر پر تن تنہا چل پڑے۔ انہوں نے لگ بھگ بیس برس تک ملک کے طول وعرض میں جگہ جگہ گھوم گھوم کر اور طرح طرح کی دشواریوں اور مصائب برداشت کر کے دیش کے مختلف علاقوں میں رائج لاتعداد لوک گیتوں کا ذخیرہ جمع کر کے اہلِ ہند کو ایسا بے مثال قومی ورثہ عطا کیا جو انہیں آج تک کوئی نہیں دے پایا تھا۔ اُن کی اس غیر معمولی کھوج پر گاندھی جی تک عش عش کر اُٹھے اور وہ ان کے اس کارنامے سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کی تعریف میں انہیں کئی خطوط ہی نہیں لکھے بلکہ اس کام کو اہم بتاتے ہوئے انہوں نے کاکا کالیلکر کو بطور ایلچی بھیج کر انہیں ہندی ساہتیہ سمیلن میں خاص طور پر شرکت کرنے کی دعوت بھی دی۔

۱۹۲۷ء میں ستیارتھی جی نے اپنے اس منتہائے مقصود کے حصول کی خاطر تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے گھر بار کو خیر باد کہا تھا اور جب لگ بھگ دو برس تک مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر کچھ مدت کے لئے وہ گھر واپس آئے تو اُن کے والد نے سوچا کہ ان کی اس آوارہ گردی کو ختم کرنے کے لئے اُن کی شادی کر دی جائے تاکہ اُن کی یہ عادت چھوٹ جائے اور وہ دنیاوی بندھنوں میں بندھ کر کسی کام کاج میں لگ جائیں مگر ازدواجی زندگی بھی ان کے جنون...... ان کے مقصد کے راستے میں حائل نہ ہو سکی اور وہ لوک گیت جمع کرنے کے لئے دوبارہ نکل کھڑے ہوئے اور ایک مدت تک گھر نہ آئے۔ اس سلسلے میں اُن کی رفیقہ حیات شانتی ستیارتھی نے لکھا ہے
''آج عمر کے اس پڑاؤ پر آ کر حیرت ہوتی ہے۔ اتنے ضدی، غیر ذمہ دار

www.taemeernews.com

اور غیر دنیادار آدمی کے ساتھ کیسے جی لیا مَیں نے؟ اور کیسے کیسے دُکھ اُٹھا کر بھی کتنی خوشی سے جی لیا۔ آج کے بہت سے ادیب ان حالات کا تصور کر کے بھی حیران رہ جائیں گے جن سے مجھے ستیارتھی جی کے ساتھ گھومتے گھومتے اور بھٹکتے ہوئے گزرنا پڑا۔ بن باسی سیتا جیسا جیون تھا اور نہ جانے کون سا شراپ تھا..... شادی کے کچھ دن بعد ساتھ رہے تھے کہ ایک دن وہ بھاگ نکلے۔ صبح صبح گھومنے گئے تھے، اُدھر ہی سے چلے گئے۔ مہینوں بعد واپس آئے۔ تب تک مَیں بھی اُن کی 'کلا' سے واقف ہو چکی تھی۔ سو مَیں نے ضد ٹھان لی جیسے ہی وہ (دوبارہ) جانے کے لئے تیار ہوئے۔ میں بولی ''مَیں بھی ساتھ چلوں گی۔ تم راجہ تو مَیں رانی۔ تُم بھکاری تو مَیں بھکارن۔'' وہ بولے ''پہلے والا چھوڑو، دوسرا ہی ٹھیک ہے'' سولوک گیتوں کے لئے ہم بھکاری ہو گئے کہاں کہاں گئی اب تو کچھ ٹھیک سے یاد بھی نہیں لیکن بڑا تکلیف دہ سفر تھا۔''

لیکن بیوی کے ساتھ ہونے پر بھی ستیارتھی جی نے کبھی بیوی کی پروا نہیں کی۔ کبھی راستے ہی میں انہیں تنہا کسی دھرمشالہ وغیرہ میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور کئی کئی ہفتے لوٹ کر نہ آتے تھے۔ جب اُن کی پہلی بیٹی کویتا کی ۱۹۳۲ء میں ولادت ہوئی تو اُس وقت بھی وہ اُن کے پاس نہیں بلکہ بہت دُور برما میں تھے۔ ایک بار تو ستیارتھی جی اپنی بیوی اور چھ سالہ ننھی بیٹی کویتا کو کلکتہ چھوڑ کر شانتی نکیتن چلے گئے اور کئی دن تک واپس نہیں آئے۔ بالآخر تنگ آ کر بیوی کمسن بیٹی کو ایک پڑوسی کے پاس چھوڑ خود انہیں لانے شانتی نکیتن جا پہنچیں۔

وہ ستیارتھی جی کے ساتھ جگہ جگی گھومتی رہیں یہاں تک وہ اُن کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں شری لنکا تک بھی گئیں مگر جب کویتا بڑی ہو گئی تو انہوں نے بیٹی کی پڑھائی کی خاطر اُن کے ساتھ گھومنا بند کر دیا اور وہ ۱۹۴۱ء میں مستقل طور پر لاہور میں رہنے لگیں۔

شانتی نکیتن میں قیام کے دوران انہوں نے گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور اور دیگر مشاہیر سے ملاقات کی اور پھر ہزاروں لوک گیت جمع کر کے تقریباً بیس برس بعد

www.taemeernews.com

لاہور لوٹے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ کچھ عرصہ اجمیر کے ویدک سنترالیہ میں جہاں سے آریہ سماج کا ''ستیارتھ پرکاش'' شائع ہوا کرتا تھا، پروف ریڈر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہاں کام کرنے کا ہی اثر تھا کہ ستیارتھ پرکاش کی ہی طرز پر انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بھی ''ستیارتھی'' کا اضافہ کرلیا۔ لاہور میں وہ کوئی پانچ سال تک مقیم رہے پھر پنجاب کے مشہور آئی سی افسر ایم ایس رندھاوا نے انہیں دہلی میں انڈین فارمنگ میں ایڈیٹر کی ملازمت دلوادی اور مئی ۱۹۴۶ء تا فروری ۱۹۴۸ء وہ اس رسالے سے وابستہ رہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ مستقل طور پر دہلی میں بس گئے اور مارچ ۱۹۴۸ء میں انہیں پبلی کیشنز ڈویژن وزارتِ اطلاعات ونشریات کے مشہور ہندی ماہنامہ 'آج کل' کا مدیر مقرر کیا گیا۔ یہ اُن کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ اس دور میں شہرت کے ساتھ انہیں دولت بھی نصیب ہوئی اور انہوں نے ''ہل مین ۵۰'' کار کے ساتھ ساتھ ڈرائیور بھی رکھا۔ لیکن بعد ازاں انہوں نے یہ گاڑی بیچ کر رہتک روڈ پر زمین خرید لی۔ اسی دوران وہ ہندی ماہنامہ ''آج کل'' سے علیحدہ ہوگئے اور خریدی ہوئی زمین پر مکان بنانے میں منہمک ہوگئے۔ اس سلسلے میں انہیں کچھ قرض بھی لینا پڑا جو سود سمیت کئی گنا لوٹانا پڑا۔

مگر اس کے باوجود اُن کی گھومنے کی عادت نہ گئی اور ایک بار پھر دسمبر ۱۹۵۶ء میں وہ یک لخت گھر سے غائب ہوگئے اور بغیر کسی کو بتائے پاکستان چلے گئے اور لگ بھگ چار مہینے تک لاہور میں مقیم رہے۔ اس دوران وہ کراچی بھی گئے جہاں وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ اس دوران اُن کے گھر والے بے حد پریشان رہے مگر اُن کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا کیونکہ انہوں نے کوئی خط تک نہ لکھا تھا۔ آخر ایک دن پاکستان کے ایک رسالے میں چھپی اُن کی کہانی سے پتہ چلا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ تب اُن کی رفیقۂ حیات نے وزیراعظم شری جواہر لال نہرو سے امداد کی درخواست کی۔ شری نہرو نے پاکستان میں انڈین ہائی کمشنر کو لکھا اور اُس نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس دہلی بھیجا۔ لیکن گھومنے اور گھر سے اچانک غائب ہوجانے کی

www.taemeernews.com

یہ عادت پھر بھی نہ چھوٹی۔ ۱۹۶۸ء میں پنڈت نیائے شرما (ماہنامہ چندن کانپور کے مالک مدیر) کے چکر میں پڑ کر وہ بمبئی چلے گئے اور ایک عرصہ تک آنے کا نام نہ لیا۔ بالآخر بیوی کی دھمکی پر کہ مَیں نے بمبئی کا ٹکٹ کٹوا لیا ہے اور تمہیں خود لینے آ رہی ہوں،، واپس دہلی آ گئے۔

لوک گیتوں سے متعلق ستیارتھی جی کی پہلی کتاب اُردو میں ''مَیں ہوں خانہ بدوش'' منظرِ عام پر آئی اور اس سے انہیں اتنی شہرت ملی کہ اُن کے چرچے بڑے زور شور سے ادبی حلقوں میں ہونے لگے بعد میں ''دھرتی گاتی ہے'' اور ''گائے جا ہندوستان'' کی اشاعت سے تو وہ اتنے مقبول و معروف ہو گئے کہ اُن کے ہمعصر رشک و حسد سے کبھی اُن کی داڑھی کا اور کبھی اُن کی شخصیت کا ''فراڈ'' اور ''بور'' کہہ کر مذاق اُڑانے لگے۔

لیکن ستیارتھی جی نے صرف لوک گیتوں کے میدان میں ہی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے تھے بلکہ انہوں نے اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی چاروں زبانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور اپنی کثیر الجہتی شخصیت کے امٹ نشان چھوڑے تھے۔ انہوں نے کہانیاں، ناول، نظمیں لکھنے کے علاوہ تراجم بھی کیے اور ہر میدان میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجابی، ہندی اور انگریزی میں لکھنے کے باوجود ستیارتھی جی بنیادی طور پر اُردو کے ادیب تھے۔ اُن کی پہلی کہانی ''اور بانسری بجتی رہی'' لاہور کے مشہور ادبی رسالے ''ادبِ لطیف'' میں دسمبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ یہی نہیں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نئے دیوتا'' بھی اُردو ہی میں شائع ہوا تھا جبکہ اُن کے ہندی میں افسانوی مجموعے ۱۹۴۹ء کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی میں زیادہ آؤ بھگت ہونے کی وجہ سے وہ بھی ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بٹوارے'' کے بعد ہندی میں اُن کے آٹھ افسانوی مجموعے۔ ''چٹان سے پوچھ لو (۱۹۴۹ء) چائے کے رنگ (۱۹۴۹) نئے دھان سے پہلے (۱۹۵۰ء) سڑک نہیں بندوق (۱۹۵۰ء) گھونگھٹ میں گوری جلے (۱۹۹۰ء) مس

www.taemeernews.com

فوک لور (۱۹۹۴ء) دیویندر ستیارتھی کی چنی ہوئی کہانیاں (۱۹۹۶ء) اور دس پرتی ندھی کہانیاں (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے ہیں مگر افسوس کہ اُردو میں اُن کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

یہی نہیں افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اُردو والوں نے اُن کی وفات کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ان کی موت کی خبر اُردو اخبارات میں یا تو چھپی نہیں یا بہت ہی اختصار میں کہ اس سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اُن کی وفات کس تاریخ کو ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اُردو والے اپنے اُن ادیبوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں جو اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی اپنا لیتے ہیں؟ کیونکہ سوائے پریم چند کے باقی سب اُردو سے ہندی کی جانب رجوع کرنے والے ادیبوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ آج کہانی کار مہاشہ سدرشن کو کتنے لوگ جانتے ہیں حالانکہ ایک زمانہ میں اُردو ادب میں اُن کا مقابلہ پریم چند سے کیا جاتا تھا جیسے بنگالی میں شرت چندر کا مقابلہ رابندر ناتھ ٹیگور سے کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح اختر حسین رائے پوری اور ہنس راج رہبر کا بھی معاملہ ہے۔ ہنس راج رہبر کی موت تو دہلی میں واقع ہوئی تھی مگر میرے خیال میں اُن کی وفات پر ایک آدھ انجمن کے علاوہ یہاں کسی انجمن یا ادارے کی جانب سے کوئی جلسہ بھی نہیں کیا گیا حالانکہ وہ بنیادی طور پر اُردو کے ادیب تھے اور اُن کی تین افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور دو تنقیدی کتابیں اُردو میں شائع ہو چکی ہیں اور اُن کی پریم چند پر کتاب تو اُردو میں پہلی تنقیدی کتاب ہے۔ لیکن آج اُس کے حوالے بھی کم دیے جاتے ہیں حالانکہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اُردو میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کے لئے یہ بہت مددگار و معاون بھی ثابت ہوئی۔ رہبر صاحب کا تو ایک طرح سے بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہیں ریڈیو اور دوردرشن پر اُردو والوں نے کبھی بلانے کی بھی زحمت نہیں کی تھی جب کہ ہندی میں دوردرشن والوں نے اُن پر اُن کی وفات سے پیشتر فلم تک بنائی تھی اور اُن کی وفات پر دلی دوردرشن سے دو تین قسطوں میں اُسے ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا تھا اور متعدد ہندی اداروں نے ملک سے

www.taemeernews.com

مختلف حصوں میں اُن کی وفات پر تعزیتی جلسے بھی کئے تھے۔ایسا کیوں ہوتا ہے یہ ایک اہم بحث طلب مسئلہ ہے اور اس پر ہمیں ایک مذاکرہ کرانا چاہیے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ ستیارتھی جی تقسیم سے پیشتر اُردو کے نامور کہانی نویس کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتے تھے اور اُردو افسانے میں انہیں ایک اہم مقام حاصل تھا اور اُن کی بعض کہانیوں کا بڑا چرچا رہا۔ یہاں تک کہ سعادت حسن منٹو نے جب اُن سے متعلق افسانہ ''ترقی پسند'' لکھا تو جواب میں انہوں نے ''نئے دیوتا'' ایسی یادگار کہانی لکھی جس کا ذکر آج بھی کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں ستیارتھی جی نے کہانی کے تکنیکی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی اور وہ 'من کی موج' کے تحت کہانیوں کی تخلیق کرتے رہے۔ انہوں نے فطری مناظر اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار نگاری پر زور دیا لیکن بعد میں انہوں نے تکنیکی پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا شروع کر دیا۔اُن کی کہانیاں قوم پرستی، جنسیاتی مسائل، معاشی عدمِ مساوات، غریبوں اور مزدوروں کی خستہ حالی اور اُن کے استحصال ایسے مسائل پر مبنی ہیں اور بنگال کا قحط، برصغیر کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات اور دوسری جنگِ عظیم جیسے موضوعات کو انہوں نے بڑے دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے اور چونکہ وہ گیتوں کی کھوج میں ملک کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہے تھے اور سفر کے دوران انہیں مختلف قسم کے واقعات اور کرداروں سے واسطہ پڑتا رہا تھا لہذا اُن کے افسانوں کا کینوس بھی بہت وسیع اور کشادہ ہے ۔انہوں نے ان کہانیوں میں واقعات اور کرداروں پر مبنی ایسی منفرد کہانیوں کی تخلیق کی ہے جو ایک مسافر .....ایک سیاح اور ایک شاعر کی داستان معلوم ہوتی ہیں جن میں لوک گیتوں کی مدھرتا اور موسیقی کا جادو بسا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے زمانے کی سچائیوں کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور ان میں اپنے ہمعصروں کے برعکس ایک ایسا جدا اور منفرد اسلوب اپنایا ہے جو اُن کی شناخت بن گیا ہے۔

ستیارتھی جی کی کہانیوں کے مجموعے تو اُردو میں شائع ہوئے ہیں لیکن غالباً

www.taemeernews.com

اُردو میں اُن کا کوئی ناول شائع نہیں ہوا حالانکہ ناول نگار کی حیثیت سے بھی ہندی اور پنجابی میں اُن کا بڑا نام ہے اور اُن کے کئی ناول جیسے 'رتھ کے پہیئے'، 'کٹھ پُتلی'، 'دودھ گاچھ'، 'برہم پُتر'، 'کتھا کہوا روشنی'، 'تیری قسم ستلج'، منظرِ عام پر آچکے ہیں نیز انہوں نے شاعری بھی کی اور مضامین بھی لکھے۔ اُن کی ان ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں کئی اداروں اور اکادمیوں کی جانب سے انعامات واعزازت بھی دیئے گئے۔ ۴۹ ۱۹ء میں بھاشا وبھاگ پٹیالہ نے انہیں شریشٹھ نثر نگار کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۷۶ء میں حکومتِ ہند نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء میں پنجاب سرکار نے شریشٹھ ہندی لیکھک کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۸۸ء میں پنجابی ساہتیہ اکادمی، دہلی نے انعام سے نوازا۔ پنجابی ماہنامہ ''آرسی'' نئی دہلی نے اُن پر خصوصی نمبر شائع کرنے کے علاوہ انہیں ایک لاکھ روپے کا انعام بھی دیا۔ مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس سلسلے میں اُردو اداروں نے انہیں بہت کم اعزازات سے نوازا۔

ستیارتھی جی صحیح معنوں میں ایک قلندر ..... ایک مست مولا ادیب تھے جنہوں نے اپنی زندگی ایک بنجارے..... ایک سیاح کی طرح گزاری۔ تلاش وجستجو کا جنون ہمیشہ اُن کے سر پر ہمیشہ سوار رہا۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں اُن کی یادداشت کچھ کمزور ہوگئی تھی اور اُن کے ہوش وحواس درست نہیں رہے تھے۔ ورنہ مطالعہ اور کھوج ہمیشہ اُن کا جنون کی حد تک بڑھا ہوا شوق رہا۔ یہاں تک کہ قرول باغ میں پٹڑی پر پرانی کتابیں اور رسالے بیچنے والوں کے پاس اکثر نظر آتے تھے اور پیسے ہونے کی صورت میں پرانی کتابیں اور رسالے خرید لیا کرتے تھے۔ یہ اُن کی ہابی تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کی بیوی کم آمدنی کے پیشِ نظر جب وہ گھر سے چلتے تھے تو اُتنے ہی پیسے دیتی تھیں جتنی ضرورت ہوتی۔ فالتو ایک پیسہ بھی نہیں دیتی تھیں تاکہ وہ پرانی کتابیں اور رسالے نہ خرید لائیں۔

مجھے یاد ہے کہ اسی جنوں کے تحت ایک دن وہ جون جولائی کو اتوار کے دن شدید دھوپ میں جب پرندے بھی اپنے گھونسلوں سے باہر نکلنے سے گھبراتے ہیں، وہ

www.taemeernews.com

میرے گھر تشریف لائے تھے۔ مَیں اسی شدید گرمی کے کارن کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہا تھا کہ کسی نے میرے گھر کے گیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مَیں جلدی سے باہر نکلا کہ اتنی گرمی میں بھلا کون آنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ دیکھا تو گیٹ پر پسینے سے تر بتر ستیارتھی جی کھڑے ہیں، حیرت ہوئی۔ اندر لا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ٹھنڈا پانی پلانے کے بعد اس سے پہلے کہ میں اُن سے اس بھری دوپہر میں آنے کا مدعا پوچھتا۔ وہ بولے، ''آپ نے ایک بار کافی ہاؤس میں ''آج کل'' کے لوک گیت نمبر کا ذکر کیا تھا۔ وہ مجھے ضرورت ہے اُدھار یا قیمتاً جیسے بھی دینا چاہیں، دے دیجئے مہربانی ہوگی مجھے ایک مضمون کے سلسلے میں اس کی اشد ضرورت ہے۔ مَیں دل میں عش عش کر اُٹھا۔''

کسی رسالے یا کتاب کے مطالعے کا یہ جنون کہ اتنی گرمی میں کوئی رہتک روڈ قرول باغ سے کرشن نگر کا بیس کلومیٹر کا سفر کرے۔ کسی مرد مجاہد کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔

تب مجھے یاد ہے کہ مَیں نے کافی ہاؤس میں باتوں باتوں میں لوک گیت نمبر کا ذکر کیا تھا مگر تب یہ سوچا تک نہ تھا کہ وہ اتنی تکلیف اُٹھا کر جھلستی گرمی میں اسے لینے کے لئے اتنی دور آ جائیں گے۔ خیر میں نے انہیں مذکورہ شمارہ اور اُن کی خواہش پر ''عالمی اردو ادب'' کے ایک دو شمارے دئے۔ اور وہ میری التجا پر بھی زیادہ دیر نہیں رکے اور کتابیں اپنے جھولے میں ڈال کر واپس اپنے گھر کی جانب چلے گئے۔

سچ مچ ستیارتھی ایک قلندر ..... ایک مست مولا ادیب تھے جنہیں لوک گیتوں کی تلاش اور کہانی نویسی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی اور جنہیں گھومنے اور تلاش و جستجو کا ایسا جنون تھا، کہ وہ ہمیشہ بنا کسی کو بتائے چپکے سے گھر سے کسی انجانی منزل کی جانب چل پڑتے تھے اور شاید ۱۲ر فروری ۲۰۰۳ء کو بھی وہ اپنی رہتک روڈ نئی دہلی میں واقع رہائش گاہ سے کسی جستجو ..... کسی کھوج میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئے کہ اب لاکھ ڈھونڈنے پر بھی انہیں تلاش کر پانا ممکن نہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

ساحر ہوشیارپوری

پیدائش: ۱۰؍فروری ۱۹۱۳ء، ہوشیار پور (پنجاب)

وفات: ۱۲؍اگست ۱۹۹۴ء (فرید آباد (ہریانہ)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ساحر ہوشیار پوری

ساحر ہوشیار پوری کی وفات کو آج ایک دہے سے زیادہ مدت ہو چکی ہے مگر آج بھی اُن کی شکل وصورت، اُن کی باتیں اور اشعار پڑھنے کا انداز مجھے بے ساختہ یاد آرہا ہے، اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے اور یادوں کے پردے پر کئی واقعات بائیسکوپ کی تصاویر کی مانند نمودار ہو رہے ہیں۔

اُردو زبان وادب سے میرا لگاؤ لڑکپن سے ہی ہو گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ ورنیکولر فائنل کے امتحان سے پہلے درسی کتابوں کے مطالعے سے میں صرف خواجہ حسن نظامی پریم چند، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم ایسے ادیبوں کے نام سے اور شاعروں میں میر غالب انشا، انیس، اقبال اور تلوک چند محروم اور خوشی محمد ناظر ایسے شعراء کے نام سے ہی روشناس ہو پایا تھا اور نصابی کتابوں سے باہر کے جس ادیب کے نام سے میں سب سے پہلے واقف ہوا وہ تھے اُس دور کے بہت زود نویس ناول نگار ایم اسلم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گاؤں کے اسکول کی چھوٹی سی لائبریری میں سب سے زیادہ کتابیں ان ہی کی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہمارے اُردو اور ریاضی کے اُستاد کا نام بھی قاضی اسلم تھا جو اسکول کی لائبریری کے انچارج بھی تھے۔

www.taemeernews.com

بعد ازاں جب ورنیکولر فائنل کے بعد میں راولپنڈی کے سناتن دھرم ہائی اسکول میں داخل ہوا تو کرشن چندر منٹو اور بیدی وغیرہ کے نام سے بھی روشناس ہوگیا مگر شاعری کی جانب کچھ زیادہ رغبت نہ ہونے کی وجہ سے اُس دور کے شعراء کے بارے میں میری معلومات کچھ حد تک محدود ہی رہیں۔

تقسیم ملک کے بعد جب مَیں نے وادیٔ ادب میں قدم رکھا تو اُس دَور میں اُردو شاعری میں جوشؔ اور ساحرؔ تخلص کے شعراء کی بھرمار تھا۔ 'جوشؔ تخلص کا تو یہ عالم تھا کہ شاعری کرنے والوں کے علاوہ نثر نگاروں اور اسٹیج سے تقریر کرنے والوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ اس تخلص کو چسپاں کرلیا تھا۔ ساحرؔ تخلص کی یہ حالت تو نہ تھی مگر کوئی علاقہ یا صوبہ ایسا نہ تھا جہاں کسی شاعر کا تخلص ساحرؔ نہ ہو خود پنجاب میں بھی کئی ساحرؔ موجود تھے۔۔لیکن اُس دَور میں پنجاب میں تین ایسے ساحرؔ موجود تھے جنہیں بہت ہی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ میری مراد ساحرؔ لدھیانوی، ساحرؔ ہوشیار پوری اور ساحرؔ کپورتھلوی سے ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان تینوں کا تعلق مشرقی پنجاب کے اُس خطے سے تھا جہاں ان تینوں شعراء کے شہر قریب قریب ہی واقع ہیں۔

لیکن تقسیم سے پہلے شعری مجموعے 'تلخیاں'' کی مقبولیت کی وجہ سے مَیں صرف ساحرؔ لدھیانوی کے نام ہی سے واقف تھا۔ ساحرؔ ہوشیار پوری صاحب سے میں اُس وقت تک متعارف نہ تھا۔ اُن سے تعارف تب ہوا جب آزادی کے بعد ان کی اور نریش کمار شادؔ کی ادارت میں کانپور سے ماہنامہ ''چندن'' کا اجراء ہوا۔

ہر شاعر یا ادیب جب کوئی تخلص اختیار کرتا ہے تو اُس کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ تخلص اس لئے اختیار کیا کہ اوائل عمر میں انہوں نے کہیں علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا کہ ؎

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی

www.taemeernews.com

سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

تو اس میں انہیں ساحر لفظ میں اتنی کشش محسوس ہوئی اور وہ انہیں اتنا بھایا کہ انہوں نے یہی تخلص اختیار کر لیا۔ مگر ساحر ہوشیار پوری صاحب نے یہ تخلص کیوں اختیار کیا یا اس کے پیچھے کیا منطق یا کہانی ہے مجھے معلوم نہیں۔ کئی بار اُن سے ملاقات ہونے کے دوران سوچا کہ اُن سے پوچھوں کہ قبلہ! آپ نے یہ تخلص کیوں اختیار کیا؟ مگر جرات نہ ہوئی۔

بٹوارے کے بعد کے چند سال انبالہ اور کانپور میں گزارنے کے بعد جب مَیں مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہو گیا اور کچھ مدت بعد مجھے ''ماہنامہ آج کل'' میں مدیرِ معاون کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا تو اُن دنوں دہلی کی ادبی تقریبوں کے علاوہ آج کل کے دفتر میں اکثر ساحر صاحب سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ آج کل کا دفتر ادیبوں اور شاعروں کا اہم مرکز تھا اور جو بھی شاعر یا ادیب دہلی آتا تھا، وہ آج کل کے دفتر میں ضرور آتا تھا۔ لیکن ساحر صاحب کا آنا دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ تھا کیونکہ ایک تو وہ عرش ملسیانی صاحب کے والدِ محترم حضرت جوش ملسیانی صاحب کے تلامذہ میں سے تھے اور دوسرے اُن کی عرش ملسیانی صاحب سے دوستی اور قریبی مراسم بھی تھے۔

ساحر صاحب کا تعلق ایک رئیس خاندان سے تھا۔ اور اُس دور میں اکثر رئیس زادے ادبی محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے لئے کسی اُستاد شاعر کو کچھ ہدیہ پیش کر کے کچھ غزلیں لکھوا لیتے تھے اور اپنے آپ کو شعراء کی برادری میں شامل کرا لیتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب رئیس زادوں کی جگہ غیر ممالک میں آباد برِصغیر کے باشندے زیادہ میدان ادب میں وارد ہو گئے ہیں جو ڈالر کے بل بوتے پر شاعر اور ادیب بن بیٹھے ہیں اور کئی رسائل تو اُن کی تخلیقات کی اشاعت پر خاص توجہ دیتے ہیں اور بعض رسائل نے تو غیر ممالک میں اردو بستیوں کے خصوصی نمبر

www.taemeernews.com

بھی نکال دیے ہیں۔ مگر ساحر صاحب اُس دور کے اُن محدود سے چند رئیس زادوں میں سے تھے جو حقیقی اور جینوئین شاعر تھے۔ شاعری میں رغبت کی وجہ سے ہی انہوں نے فارسی میں ایم اے کیا تھا اور شعری ادب کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ اور لگ بھگ سات دہائیوں تک شعر و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے تھے۔

اُن کی سب پہلی تصنیف ''مہاویر مہما'' مسدس کی شکل میں ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آئی تھی اور اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''سحر نغمہ'' ۱۹۵۹ء میں اشاعت پذیر ہوا اور اُس کے بعد دو مجموعے ''سحر نغمہ'' اور ''سحر حرف'' سے ادبی دنیا روشناس ہوئی۔ ہوسکتا ہے اُن کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی ہو۔ تاہم اُن کے مطبوعہ کلام کے مطالعہ سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اُستاد محترم کی طرح قدیم روش کی شاعری کی تقلید کرتے رہے تھے لیکن اس طرح کہ انہوں نے اُردو غزل گوئی کی صحت مند اقدار اور روایات کو اپنا کر اس میں لطافت، جدت اور دلآویزی کی خصوصیات پیدا کر کے سامعین اور قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ خود انہیں بھی اپنے کلام کے جادو پر بڑا ناز تھا اور اُن کا ارشاد تھا کہ ؎

جاگیر اپنی شاعری پہلے سے تھی مگر
اِک عمر جب ریاض کیا ساحری ملی

اُن کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جو سامعین اور قارئین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور درج ذیل شعر میں تو انہوں نے چند الفاظ میں زندگی کی بہت بڑی حقیقت کو آشکارہ کر دیا ہے کہ:

گرد کی تہ میں رہنے دو اِسے آسودہ
زندگی آئینہ دیکھے گی تو ڈر جائے گی

یہی نہیں اور بھی بہت سے اشعار میں اُن کا آہنگِ حیات اور رنگ خمریات

www.taemeernews.com

دیکھا جا سکتا ہے جیسے

کیا ہوا بند ہے جو بابِ حرم در کھلا ہے شراب خانے کا
گرمیِ فرقت میں یوں ہوا محسوس زندگی ایک سزا ہو جیسے
اب محبت کے پرستار کہاں ہیں ساقی سب محبت کے خریدار نظر آتے ہیں

ساحر صاحب نے شاعری کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ انہوں نے کئی جریدوں کی ادارت کی اور بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے دوران وہ ہوشیار پور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''کیلاش'' کے مدیر رہے۔ پھر ۵۰۔۱۹۴۹ء میں وہ کانپور سے ماہنامہ ''چندن'' نکالتے رہے جسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اور بعد ازاں ۶۸۔۱۹۶۷ء میں دہلی سے ماہِ نو اُن کی ادارت میں شائع ہوتا رہا مگر اُن کے اس پہلو کے بارے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔

گو یہ سچ ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے تاہم اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اُن کے صحافتی پہلو کو بھی اُجاگر کیا جائے خصوصاً بٹوارے سے پیشتر ہوشیار پور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''کیلاش'' سے متعلق اُن کی ادارتی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔

ساحر صاحب سے میری آخری ملاقات اُن کی وفات سے کوئی سال سوا سال پہلے دہلی میں گوپال متل صاحب کے انتقال پر راجندر نگر نئی دہلی میں منعقد تعزیتی اجتماع (رسم کریا) میں ہوئی تھی جس میں بہت سے ادیب اور شاعر اُنہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے شریک ہوئے تھے۔ تقریب کے اختتام پر مندر کے ہال سے باہر نکلنے پر جب ہم لوگ ایک دوسرے سے مل رہے تھے تو ساحر صاحب نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دیکھ کر ایک سوالیہ جملہ کہا تھا کہ ''کیا نارنگ صاحب آپ اسی طرح میری وفات پر بھی آئیں گے؟'' یاد نہیں اُس وقت نارنگ صاحب نے کیا جواب دیا تھا۔ شاید وہاں کھڑے کسی شخص نے بھی اس جملے کی جانب توجہ نہ دی ہو مگر معلوم نہیں مَیں یہ

www.taemeernews.com

جملہ کیوں نہیں بھلا پایا لہذا اس واقعہ کے بعد جب فرید آباد میں اُن کی وفات ہوگئی اور تاخیر سے مجھے یہ اطلاع ملی تو خبر سنتے ہی میرے ذہن میں وہی جملہ عود کر آیا کہ کس حسرت و یاس سے انہوں نے نارنگ صاحب سے ایک طرح سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اُن کے تعزیتی جلسے میں بھی اسی طرح شریک ہوں۔ ہوسکتا ہے نارنگ صاحب شامل بھی ہوئے ہوں یا ہوسکتا ہے کہ وہ دہلی سے ہی باہر گئے ہوئے ہوں یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے وہ اس میں شریک ہونے سے قاصر رہے ہوں تاہم یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے کہ'' کیا نارنگ صاحب آپ میرے تعزیتی جلسے میں بھی اسی طرح تشریف لائیں گے؟؟''

☆☆☆

www.taemeernews.com

سردار جعفری

پیدائش: ۲۹ رنومبر ۱۹۱۳ء، بلرام پور (اُتر پردیش)

وفات: یکم اگست ۲۰۰۰ء ممبئی (مہاراشٹر)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

سردار جعفری

ایک مطالعہ

عام طور پر علی سردار جعفری کی شہرت ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے ہی رہی ہے حالانکہ وہ ایک نامور شاعر ہونے کے علاوہ ایک جانے مانے نثر نگار، صحافی، محقق، خطیب، فلم ساز و ہدایت کار بھی تھے اور ان کی ہشت پہلو شخصیت نے کئی میدانوں میں اپنی کارکردگی کے جوہر دکھائے تھے۔

سردار جعفری نے اپنا ادبی سفر ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں بچے پیدا ہوتے ہی مجلسوں میں شرکت کرنے لگتے ہیں اور مرثیوں کی آواز اُن کے کانوں میں گونجنے ہی نہیں لگتی بلکہ وہ انہیں گنگنانے بھی لگتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں بچے کے کان میں کلمہ اور تکبیر کے بعد انیسؔ اور دبیر کے مرثیوں کی آواز کان میں پڑتی ہو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس کے اثرات سے بچ سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی میں جب وہ پانچ چھ برس کے تھے تو منبر پر بیٹھ کر مرثیے پڑھنے لگے۔ اور مرثیوں اور سلام کے علاوہ انہیں متعدد اشعار بھی یاد ہو گئے۔ ابتدا میں وہ انیسؔ کے مرثیے پڑھتے تھے لیکن جب وہ پندرہ سولہ برس کے ہوئے تو خود بھی انیسؔ کے لب و لہجہ میں مرثیے کہنے لگے۔ اور بہت جلد وہ اپنے حلقے میں ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ بقول ان کے:

www.taemeernews.com

''مَیں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دئے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے، اُن کی زبان، تشبیہہ استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا، مَیں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لئے یہ بند کافی تھے۔ جب میں نے پہلا مرثیہ کہا۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں بٹھاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی''

لیکن شاعری کا یہ دَور وقتی طور پر ختم ہو گیا اور انہوں نے اسکول کے زمانے میں شاعری کے بجائے افسانہ نگاری شروع کر دی اور وہ اپنی فرصت کے اوقات میں آتشیں قمیض'' اور ''لالہ صحرائی'' ایسے افسانے لکھنے لگے۔ اور اُن کا پہلا افسانہ ''تین پاؤ گندھا آٹا'' کے عنوان سے اُن کے بڑے بھائی ظفر عباس کے ہفتہ وار رسالے 'ہمصفیر' میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

افسانہ نویسی کا یہ سلسلہ چند سال تک محیط رہا اور ۱۹۳۸ء میں اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' بھی اشاعت پذیر ہوا جو اُن کے پانچ افسانوں (منزل، بارہ آنے، باپ، مسجد کے زیرِ سایہ اور آدم زاد) اور ایک ڈرامہ ''سپاہی کی موت'' پر مشتمل

www.taemeernews.com

تھا۔ کتاب میں شامل مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ ایک قابلِ ذکر افسانہ ''چہرو مانجھی'' اُن کی کتاب ''لکھنو کی پانچ راتیں'' میں بھی شامل تھا۔ جو جنگ کے دوران کی ایک یادداشت ہے لیکن جس میں بنگال کے ساحلی علاقوں کی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اُس علاقے کی بستی کی ایک لڑکی چہرو مانجھی کی داستان بھی قلمبند کی گئی ہے اور جو دلچسپ ہی نہیں بلکہ اُس دور کے ناگفتہ بہ حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ اُن کے کچھ اور افسانے بھی شائع ہوئے ہوں گے لیکن چند سال کی گرمجوشی کے بعد انہوں نے اس صنف کو خیر باد کہہ دیا اور پھر شاعری کی جانب منعطف ہوئے اور بڑی سنجیدگی سے اُنہوں نے اپنے آپ کو شاعری کے تئیں وقف کر دیا اور جلد ہی وہ بطور شاعر دنیائے ادب میں مشہور ہو گئے اور لوگ بھول گئے کہ وہ کبھی افسانے بھی لکھا کرتے تھے۔

علی سردار جعفری کی شاعری کو ناقدین عام طور پر دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں پہلے دور میں وہ اپنی سیاسی سوچ اور کمٹمنٹ سے اس قدر مغلوب ہیں کہ وہ اس کے حصار سے باہر نکل ہی نہیں پائے اور نتیجتاً اُن کی شاعری اُن کے سیاسی نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بن کر رہ گئی لیکن دوسرے دور میں وہ آہستہ آہستہ اس حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے اور پھر ایسا دَور آیا جب اُن کی شاعری سیاسی پراپیگنڈے کے الزام سے بری ہو گئی اور اُن کی فکر و سوچ میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی گئی۔ تب انہوں نے ایسے منظوم فن پارے تخلیق کیے جنہیں اُردو شاعری میں قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

سردار جعفری کے اولین دَور کی شاعری میں جوشؔ ملیح آبادی کا رنگ صاف صاف جھلکتا ہے اور وہ اُن سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ بعض مقامات پر اُن کی شاعری صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی نظم ''بغاوت'' ایک ایسی ہی مثال ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا

www.taemeernews.com

بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت سرسوتی سے، لکشمی سے بھیم وارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے

اُن کی شاعری کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اپنی شاعری کے اس ابتدائی دور میں وہ سیاسیات اور اشتراکی نظریات کے اتنے زیرِ اثر تھے کہ ان کی نظموں پر اس کا گہرا اثر صاف دکھائی پڑتا ہے۔ انہوں نے سیاسی خبروں، واقعات، اخباری اداریوں تک کو اپنی نظموں کا موضوع بنالیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ان اثرات سے آزاد ہوتے گئے اور آزادی کے چند برس بعد اُن میں بتدریج کمی آتی گئی اور بالآخر اُن کی شاعری بہتر سے بہتر ہوتی گئی۔ اور اس کا اقرار بہت سے ناقدین و محققین نے کیا ہے۔ جیسا کہ نامور نقاد وارث علوی نے اپنے ایک حالیہ مقالے میں اس تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''ایک 'خواب اور' اور اُس کے بعد کے مجموعوں میں نظم کے فارم کی طرف سردار کا رویہ زیادہ ذمہ دارانہ اور با شعور بن گیا ہے۔ غالب شعری رویہ پابند نظموں کی طرف ہے اور آزاد نظمیں بھی بیجا پھیلاؤ سے محترز اور اختصار اور کفایت کی طرف مائل ہیں۔ اسلوب استعاراتی اور علامتی اور خوبصورت فارسی تراکیب اور بندشوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ سبک، سجل اور برجستہ ہے۔ زبان سادگی میں سپاٹ نہیں بنتی اور ترصیع میں اغراق پیدا نہیں کرتی۔ صرفی اور نحوی دروبست میں سلاست اور روانی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ آہنگ بلند لیکن پُر وقار ہے اور کبھی بے قابو ہوکر چیخ و پکار یا اصوات کا جھمیلا نہیں بنتا۔''

www.taemeernews.com

(علی سردار جعفری کی شاعری مطبوعہ سہ ماہی اُردو ادب نئی
دہلی۔جنوری مارچ ۲۰۰۰ء ص۔۴۸)

اسی طرح پاکستان کے ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی نے بھی سردار جعفری کی شاعری میں وقوعہ پذیر ہونے والی اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں تحریر کیا ہے:

> علی سردار جعفری نے ''لہو پکارتا ہے'' میں شامل ۱۹۶۵ء کی شاعری کے بعد ہی جوشؔ کے اثرات سے نکلنے کی کامیاب کوشش کی۔یہی وہ موڑ ہے جب اُن کے یہاں تشبیہہ کے مقابلے میں استعارہ اور ادعایت کے مقابلے میں ایمائیت کے لئے شیفتگی کا مظاہرہ شروع ہوجاتا ہے۔''نومبر میرا گہوارہ'' جو غالباً ابھی تک ناتمام ہے اس دائرہ کی تکمیل کرتی ہے۔میرا خیال ہے کہ سردار جعفری نے اس عرصہ میں پابلو نرودا اور بھگتی تحریک کے شاعروں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے۔''

سردار جعفری کی شاعری نے بتدریج ترقی کی منازل طے کیں اور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں تک پہنچنا بہت کم شعرا کو نصیب ہوتا ہے۔اُن کی شاعری کی ایک خوبی ہے کہ کلاسیکی مزاج رکھنے کے باوجود پرانے ڈگر پر چلنے کے بجائے انہوں نے اپنی شاعری میں جدت طرازی اور انفرادیت کی ایسی چھاپ چھوڑی ہے جس نے اُن کی شاعری کو منفرد و ممتاز بنا دیا ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے اپنی شاعری میں مختلف طرح کے تجربے بھی کئے ہیں۔دوسرے شعراء کے برعکس اس میں عوامی زبان کا استعمال بھی کیا ہے اور سائنسی اور صنعتی ماحول سے متاثر ہوکر نئے نئے شعری پیکر ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے اور ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو عموماً ہماری شاعری میں متروک ہیں یا جنہیں استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک

www.taemeernews.com

خط میں اپنی اہلیہ سلطانہ جعفری کو لکھا تھا:

''اب سکون ہے اور سناٹا۔ نئے نئے شعری پیکر ڈھل رہے ہیں جن سے ہماری شعری روایت بالکل بیگانہ ہے۔ شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر، رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام، گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں۔ بارود کا کاجل، فولاد کے ہونٹ، سیسے کی زباں اُردو کی نازک مزاجی اس اندازِ بیاں کو کیسے برداشت کر سکے گی یہ خمِ شمشیر، تیرِ نگاہ اور پیکانِ یار سے کس قدر مختلف ہے۔ اُردو والوں کو میری شاعری سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ لندن والوں نے تو اب تک اقبال کو بھی قبول نہیں کیا ہے جس کی ساری شعری روایات کلاسیکی ہیں۔

(گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر، جلد اول ۱۹۸۰ء)

لیکن لاتعداد یادگار اور بلند پایہ منظوم تخلیقات پیش کرنے کے باوجود بعض ناقدین نے اُن کی شخصیت کو سردار جعفری ایک متنازعہ فیہ شخصیت بنا دیا ہے اور اُن کی شاعری کی قدر و اہمیت کو صحیح ڈھنگ سے آنکا نہیں گیا اور بعض نے تو گروہ بندی، ادبی چشمک اور ذاتی تعصب کی بنا پر اُن کی شاعری کے بارے میں ایسی ایسی گل افشانیاں کی ہیں کہ اُن کی تنقیدی رائے پر اظہار افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں نقاد اور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اُن کی شاعری پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے صرف اُن کی اولین دَور کی شاعری کو ہی غالباً مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ:

''انہوں نے اپنے مواد عام طور پر ''قومی جنگ'' میں شائع ہونے والی خبروں اور اداریوں، سیاسی جماعتوں کے

www.taemeernews.com

سالانہ کانفرنس کی تقریروں اور قراردادوں، عوامی لیڈروں کے
بیانات اور آخر آخر پبلو نرودا، پال ایلیو، اور مائیکافسکی کی نظموں
کے تراجم سے حاصل کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں
وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی شروع ہی سے کھٹکتی رہی''

(اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۱۴۳)

اور ابھی حال ہی میں سردار جعفری کی شاعری پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر محمد حسن نے اُن کی تمام شاعری کو نکارتے ہوئے انہیں صرف تین نظموں اور تین شعروں کا شاعر کہہ کر اہل اُردو کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔ انہوں نے دہلی کے ماہنامہ ''ایوانِ اُردو'' کے ستمبر ۲۰۰۰ء کے علی سردار جعفری نمبر میں شامل اپنے مضمون ''سردار جعفری کو آخری سلام'' میں لکھا ہے کہ پبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم ''میرا سفر'' لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اُردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلاشبہ ''تین شرابی'' اور ''میرا سفر'' نظمیں شامل ہیں اور غزل کے دو تین شعر جن میں وہ بے پناہ مصرعہ بھی شامل ہے۔۔۔ راستے بند ہیں کوچہ ء قاتل کے سوا۔''

لیکن کیا کسی بڑے شاعر، فلسفی، سیاست داں یا دانشور سے متاثر ہونا یا اس کے خیالات و نظریات یا انداز کو اپنانا یا اُس کی پیروی کرنا کوئی عیب ہے؟ کیا سردار جعفری سے پیشتر ہمارے شاعر اور ادیب کسی سے متاثر نہیں ہوئے؟ اگر ایسی بات ہے تو غالب، اقبال، فیض سب ہی اپنے متقدمین سے متاثر ہوئے ہیں تو پھر اُن کے بارے میں ہم کیا کہیں گے؟

اسی طرح ہمارے ترقی پسند شاعر معین احسن جذبی نے تو انہیں سرے سے

www.taemeernews.com

شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ:

''وہ ایک اچھا نثر نگار تو ہو سکتا ہے لیکن ایک اچھا شاعر نہیں۔ نہ تو وہ فطری شاعر ہے اور نہ ہی اس کے یہاں کوئی شعریت ہے۔ مَیں نے اپنے کئی انٹرویو میں یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طرح نظم کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں اسے شاعر تسلیم نہیں کرتا۔''

حالانکہ دیکھا جائے تو جذبی صاحب کی بات میں کوئی وزن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اصل فیصلہ شاعر کی زندگی میں کم اور موت کے بعد بہتر ڈھنگ سے کیا جاتا ہے اور سردار جعفری کی وفات کے بعد اُن پر نقادوں، محققوں اور ادیبوں نے ان سے متعلق جو متعدد مضامین لکھے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر اُن کی شاعری سے ہی متعلق ہیں جن میں اُن کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی میں تو شاعر اور ادیب جوڑ توڑ کر کے بھی اپنے بارے میں مضامین لکھوا سکتے ہیں لیکن موت کے بعد نہیں۔ اتنے سارے مضامین اور خصوصی شمارے ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ شرف کسی اہم اور جینوئن شاعر کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں علماء دین متین اس مسئلے کے؟؟

لیکن کیا وجہ ہے کہ سردار جعفری کے زیادہ تر معترضین وہ حضرات ہیں جو کبھی ان کے قریبی ساتھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے ہیں؟ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ سجاد ظہیر کے پاکستان چلے جانے کے بعد ترقی پسند تحریک کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں آ گئی اور تنظیم کو چلانے سے متعلق اُن کے طریقہ کار سے ان کا اپنے بعض قریبی ساتھیوں سے اختلاف ہو گیا اور انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور بتدریج ایسی شدت اختیار کی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا اور اس کے ساتھ ہی سردار جعفری کے طریقہ کار سے انجمن پر اُن کی گرفت بھی ڈھیلی

www.taemeernews.com

ہوتی گئی ۔اور پھر ایمرجنسی کے دوران تو اُن کے نقطہ ءنظر نے اُن کے بہت سے ساتھیوں کو اُن سے مایوس ہی نہیں بلکہ دُور بھی کر دیا اور وہ تحریک جو آزادی کے حصول میں پیش پیش ہی نہیں رہی بلکہ ملک میں فرقہ وارانہ قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ، مزدوروں، کسانوں اور ملک کے غریب طبقے کے حق میں بھی آواز بلند کرنے میں سب سے آگے تھی، رو بہ تنزل ہوگئی اور بالآخر یہ ملک گیر تنظیم صرف کاغذوں پر ہی رہ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کمزور پڑتی گئی وہاں سردار جعفری کی شاعری بتدریج بلندیوں کی جانب رواں رہی اور انہوں نے شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ معلوم نہیں تحریک سے اختلاف اور ذاتی اختلاف و رنجش کو اُن کی شاعری سے کیوں وابستہ کیا گیا؟ اس کے علاوہ تحریک سے متعلق اُن کی کارگزاریوں کا اُن کی شاعری سے کیا واسطہ؟

بہر حال سردار جعفری کی شاعری پر حرف گیری کرنے اور اسے کمتر بتانے کا سلسلہ اُردو میں کوئی نئی بات بھی نہیں۔ ایسا اُردو کے کئی بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ خود غالب اور اقبال ایسے عظیم شاعر بھی اس طرح کے حملوں سے نہیں بچ سکے اور ان کی شاعری بھی تضحیک و مذاق کا نشانہ بنائی گئی۔ غالب کی شاعری کا مذاق اُڑاتے ہوئے "پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال" ایسے مہمل اور مضحکہ خیز اشعار کو اُن سے منسوب کر کے اُن کا مذاق اُڑایا گیا اور بھری محفل میں انہیں مخاطب کر کے کہا گیا ؎

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس طرح شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شاعری کے نکتہ چینوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اُن کی خامیوں کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا گیا اور ان خامیوں کو 'جراح' نامی فرضی مصنف کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی کیا گیا۔ یہی نہیں

www.taemeernews.com

لکھنؤ کے بزرگ شاعر پیارے صاحب رشید نے تو اُن کے کلام کو اُردو شاعری ماننے سی ہی انکار کر دیا تھا، لیکن ان تبصروں اور رائیوں کے باوجود آج غالب اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کے سبھی قائل ہیں لہذا سردار جعفری کے بارے میں بھی مذکورہ بالا رایوں کو اُردو اہل الرائے ادبی چشمک اور ذاتی معاملہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ اُن کے بارے میں اکثر ناقدین کی رائے ہے کہ وہ اُردو شاعری میں ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں جن کا شمار ہمارے عہد کے چند برگزیدہ شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کا کینوس بہت وسیع و عریض ہے اور وہ کسی خطے، ملک، فرقے، قوم یا گروہ کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ اُن کی شاعری میں دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ مذہبی رواداری، امن و آشتی، انسان دوستی اور حب الوطنی کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ خاص طور پر امن اور بھائی چارہ ایک ایسا موضوع رہا ہے جس پر انہوں نے بے شمار یادگار نظموں کی تخلیق کی مگر ہند و پاک جنگوں کے پس منظر میں لکھی گئی اُن کی نظمیں ''صبح فردا'' اور ''کون دشمن ہے'' کا کوئی جواب نہیں اور یہ ایسی نظمیں ہیں جنہیں برصغیر کے عوام کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ حالانکہ انہوں نے میر، غالب، میرا اور اقبال پر جو کام کیا ہے وہ بھی ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور اُن سے اُن کی شہرت و عظمت میں ہی گراں قدر اضافہ نہیں ہوا بلکہ اُن کی تحقیقی بصیرت اور علمی کاوش کا بھی اہل نظر پر سکہ جم گیا ہے۔

مختصر یہ کہ اُردو ادب میں وہ ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے ہی یاد کئے جائیں گے۔ کیونکہ اُن کی شاعری کی جڑیں ہمیشہ اس دھرتی اور اس کے عوام سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اس میں ترقی پسند نظریات، عصری تقاضوں، حب الوطنی، انسان دوستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، عالمی بھائی چارے اور سیکولرزم کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جس نے انہیں اس دور کا ایک ایسا آفاقی شاعر بنا دیا ہے جو اُردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

شباب للت

پیدائش: ۲۴/مارچ ۱۹۳۳ء (پنجاب)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شباب للت

ایک شاعر۔ایک محقّق

اُردو کے معروف کہنہ مشق شاعر شبابؔ للت صاحب کو، جو آج لگ بھگ ڈیڑھ درجن شعری مجموعوں اور متعدد کتابوں کے ترجمہ و تالیف سے اُردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کرنے کے علاوہ علامہ منور لکھنوی مرحوم پر اپنا گراں قدر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر چکے ہیں، مَیں تب سے جانتا ہوں جب وہ زائد از نصف صدی پیشتر شباب للت کے نام سے نہیں بلکہ بھگوان داس شمیمؔ للت کے نام سے دنیائے شاعری میں نو وارد شاعر کی حیثیت سے قدم رکھ چکے تھے اور انبالہ میں میری طرح زیرِ تعلیم تھے۔

غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔شری آتما نند جین کالج انبالہ شہر میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا جس میں جالندھر سے فکرؔ تونسوی، مخمورؔ جالندھری، تاجورؔ سامری اور بلراج کومَلؔ کے علاوہ اخترؔ رضوانی بھی شریک ہوئے تھے۔اسی مشاعرے کے دوران میرا اُن سے بحیثیت شاعر بھگوان داس شمیمؔ للت تعارف ہوا تھا۔اور چونکہ اُن دنوں

www.taemeernews.com

مَیں بھی انبالہ میں ہی قیام پذیر تھا اور اُن ہی کی طرح اس کوچے میں نیا نیا وارد ہوا تھا لہذا اُن سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں جو بعد میں ایک دوستی میں بدل گئیں۔ بعد ازاں جب مَیں کانپور چلا گیا جہاں سے مَیں نے ماہنامہ 'نئی کہانی'' کا اجراء کیا تھا تب بھی اُن سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب اُن کی شادی کے تین برس بعد ہی اُن کی پہلی رفیقۂ حیات کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہوگیا تو انہوں نے مجھے انتہائی رنج وغم کی حالت میں بہت ہی دل گداز خط لکھا تھا۔ اُس وقت اس سانحہ نے اُن پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور انہوں نے اُس کی یاد کو اپنی شاعری میں بھی بڑے پُرتاثیر انداز میں منعکس کیا تھا:

راہِ منزل میں جدا ہوجائے جس کا ہم سفر
زندگی میں زندگی کا ہو اسے احساس کیا

اب تو کوئی یاد تک دستک نہیں دیتی یہاں
دل کا دروازہ کریں تو کس کی خاطر وا کریں؟

کوئی منزل اس سفر کی اب مجھے ملتی نہیں
تم نے چھوڑا جس سفر میں ساتھ میرا ناگہاں

یہی نہیں پھر جب روہتک سے اُن کی زیرِ ادارت ماہنامہ ''لہریں'' منظرِعام پر آیا تو انہوں نے مجھے بھی اس رسالے میں لکھنے کی دعوت دی اور میرے افسانے ''ماضی، حال اور مستقبل' کو اس میں شاملِ اشاعت کیا۔

ہمارے کالج کے دنوں میں ترقی پسند شاعر شرر فتح پوری اور اسیر منی مزرعوی بھی انبالہ چھاؤنی کے جی۔ ایم۔ این کالج میں زیرِتعلیم تھے۔ اور چونکہ شرر اور میرا اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور ترقی پسند تحریک سے بھی واسطہ تھا لہذا ہم نے شباب صاحب کو بھی انجمن ترقی پسند مصنفین میں شرکت کی دعوت دی مگر وہ اس میں غالباً چند بار ہی بد

www.taemeernews.com

دلی سے شریک ہوئے اورانہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

بعدازاں ملاقاتوں کا سلسلہ بوجوہ کم ہوگیا حالانکہ ہم ایک ہی وزارت سے وابستہ تھے مگر محکمے الگ الگ ہونے سے کم وبیش ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔وہ ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی سے منسلک رہے اور مَیں پبلی کیشنز ڈویژن کے ماہنامہ آج کل اور پریس انفارمیشن کے شعبۂ اُردو سے۔تاہم اُن کی ادبی سرگرمیوں سے مَیں ہمیشہ آگاہ رہا اور اُن کے نت نئے شعری مجموعوں سے متعارف ہوتا رہا۔غالباً وہ اپنے تمام ہمعصر شعراء سے زیادہ زود گو ہیں۔انہوں نے اُردو کے متعدد شعری مجموعوں کے علاوہ ہندی، ہماچلی اور اپنی مادری زبان سرائیکی میں بھی اپنی شعری تخلیقات کتابی صورت میں پیش کی ہیں اور داد وتحسین پانے کے علاوہ اپنی تصانیف پر کئی انعامات و اعزازات بھی حاصل کیے۔

شبابؔ نے اوائل عمر میں ہی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اور اپنی ریاضت، لگن اور محنتِ شاقہ سے اس فن میں ایسی مہارت حاصل کی جس کے بغیر شاعری کے دشوار راستے پر چلنا انتہائی دشوار کام ہے۔اُنہوں نے زبان، عروض اور فن پر مکمل دسترس حاصل کرنے کے بعد ہی اس وادیِ پُر خار میں قدم رکھا اور غور وفکر کے بعد ہی طبع آزمائی کی شروعات کی تاکہ اُن کی زبان وعروض پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کو خوبصورت اور دلکش انداز میں استعمال ہی نہیں کیا بلکہ اپنی شعری تخلیقات میں دیومالائی تلمیحوں اور تلازموں کا استعمال بھی اتنی کثرت وخوبی سے کیا ہے کہ شاید ہی ہمارے عہد کا کوئی دیگر شاعر کر سکا ہو۔وہ حساس انسانی دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو آج کے دور کی پریشانی، بدحواسی، بے چہرگی، تنہائی،، بے یقینی نیز رشتوں اور تہذیبی اقدار کے انتشار کا شکار ہو چکے ہیں۔

www.taemeernews.com

جیسا کہ مَیں پہلے تحریر کر چکا ہوں وہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے چند ہی اجلاس میں شامل ہوئے تھے اور یہ بات ان کے کلام کے مطالعے سے بھی ہم پر عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ ادب کی مختلف تحریکوں اور نظریات سے متاثر تو ضرور ہوئے ہیں لیکن کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔

شبابؔ صاحب نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں وافر کلام پیش کیا ہے جس میں کلاسیکیت سے جدیدیت تک کے انداز و اسلوب پائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے بھی اُردو کے اکثر شعراء کی طرح زیادہ تر توجہ غزل پر ہی دی ہے اور اس میں اپنے فنی جوہر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اُن کی بعض غزلیات کے کئی اشعار تو ہمیں متاثر ہی نہیں کرتے بلکہ دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

اِک مسلسل شور کی زد میں ہے اب ذہنِ بشر
اس مشینی یگ میں آوازیں بھی پتھر ہو گئیں

کیا خبر ظالم ہوا مجھ کو کہاں لے جائے گی
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی ہے منزل کہاں

کیسے عاشق تھے فقط موہوم وعدوں کے عوض

www.taemeernews.com

زخم پچھلی ہجرتوں کے دِل پہ تازہ ہیں ابھی
جب بھی یاد آئیں وہ گھڑیاں تیر و نشتر ہوگئیں

تپتی سڑک پہ موم کے رتھ پر سوار لوگ
انجام سے خود اپنے خبردار بھی نہیں

تمہیں بھی کل وہ تماشائیو نہ بخشے گا
جو خنجر آج مرے خون میں نہایا ہے

یہی نہیں نظم میں بھی انہوں نے کئی یادگار نظمیں پیش کی ہیں اور اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ موضوعاتی نظمیں کہنے میں انہیں خصوصی دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے گوناگوں موضوعات خصوصاً وطنی، قومی اور سماجی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان میں ادبی معیار کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میدان میں انہوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو اُن کے کمالِ فن کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے معاشرے کے مختلف مسائل پر ایسی دل پذیر اور پُر تاثیر نظمیں کہی ہیں کہ منور لکھنوی صاحب ایسے اُستادِ فن بھی اس میدان میں اُن کی مہارت و دسترس کے قائل ہو گئے اور انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:

''شباب کا بھی اصلی رنگ و روپ دیکھنا ہو تو آپ ان کو نظم کے آئینہ میں دیکھیں۔ جہاں دوسرے گوناگوں موضوعات پر وہ اپنے دل کی بات بہت تاثیر انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں وہاں جب وہ اپنی پہلی رفیقۂ حیات کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتے ہیں تو ان کے دل کی صحیح تصویر

www.taemeernews.com

ان کے جذبات کے ذریعے اُبھر آتی ہے۔انہوں نے قوم اور وطن
کے لیے بہت کچھ کہا ہے سماج کو بھی مخاطب کیا ہے۔منظر نگاری
بھی کی ہے، اور دوسری حقیقتوں کو بھی نظم کے لباس سے آراستہ کیا
ہے لیکن ان کا اندازِ بیان شعری کیفیت سے خالی نہیں۔''

شاعری کے علاوہ شباب صاحب کا اہم کارنامہ اپنے اُستاد منوّر لکھنوی پر لکھا اُن کا تحقیقی مقالہ ہے جو اگرچہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا تھا مگر اس میں انہوں نے منوّر لکھنوی صاحب کی زندگی، فن، شعری علمی وادبی کارناموں کی ایسی مکمل تفصیل فراہم کردی ہے جو آنے والے محققین کے لئے مشعل راہ کا کام کرے گی اور جس کے بغیر منوّر لکھنوی صاحب پر کوئی بھی تحقیق مکمل نہیں ہو پائے گی، بقول پروفیسر گیان چند جین:

''شباب کا مقالہ پڑھنے سے منوّر لکھنوی کی شخصیت
اور ان کے متنوع کاموں سے بھرپور آگاہی ہو جاتی ہے۔منوّر
کی تصانیف اور تالیفات کو پڑھے بغیر ہی قاری ان سب کے
بارے میں اتنا کچھ جان جاتا ہے جیسے اس نے واقعی ان کی
ورق گردانی کی ہو۔اتنا طمانیت بخش کام کرنے پر شباب للت
کو بھی احساسِ سرخروئی ہونا چاہیے۔اس کتاب کا کمال یہ ہے
کہ اسے پڑھ کر منوّر کی کتابوں کو پڑھنے کی تحریک آتی ہے۔
مقالہ نگار شاگرد کو اس سے زیادہ کیا چاہیے؟''

شباب نصف صدی سے شعروادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اگرچہ انہیں کئی انعامات واعزازات سے نوازا جاچکا ہے مگر انہیں احساس ہے کہ ایسے امور میں نہ ہی سینئریٹی اور استحقاق ملحوظ نظر ہوتا ہے نہ ہی فنی خدمات کا یا تصانیف وتالیفات

www.taemeernews.com

کا بلکہ اس سلسلے میں کسی مخصوص گروہ اور اہل سیاست کے آستانوں پر سجدہ ریزی کرنے والے حضرات کا ہی بول بالا ہے۔اُن کی ایک غزل کا مقطع اُن کے اس روحانی کرب کا مظہر ہے۔

دنیا کبھی تو مجھ کو بھی دے گی مرا مقام
یہ بھی شبابؔ اپنا خیالی پلاؤ ہے

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی شکایات اکثر شاعروں اور ادیبوں کو ہوتی ہے اور کچھ حد تک یہ صحیح بھی ہے مگر بعض اوقات ہم ادیب اور شاعر بھی اپنے بارے میں کچھ خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ ادیب کا کام اپنے ادبی کاموں کی جانب ہی توجہ دینا ہے نہ کہ انعامات واعزازات پانے کی جہد میں۔کیونکہ اس دور میں اکثر بے انصافی ہوتی ہی رہتی ہے اور بوجوہ بعض اوقات انعام کے مستحق حضرات کو محرومی سے ہی سابقہ پڑتا ہے؟لہذا شباب صاحب کو بھی چاہیے کہ وہ ان نام نہاد انعامات واعزازات سے بے نیاز ہوکر تخلیقی کاوشوں کا اپنا ادبی سفر جاری رکھیں اور اُردو کے ادبی سرمائے میں اضافہ کریں اور اپنے اس شعر کی عملی تصویر بنیں کہ:

جو اہلِ سیاست کی، توصیف سے حاصل ہو
اس خلعتِ زریں کو شاعر کی بلا اوڑھے

اور ہاں! اگر چہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شباب صاحب کی نظم وغزل دونوں پر گرفت مضبوط ہے اور انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے مگر بعض جگہ اُن کی یہ طبع آزمائی انہیں عام شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے جو سرکاری اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں کی فرمائش پر چند سو روپیوں یا اُس موقع سے استفادہ کرنے یا اخبار یا رسالے میں شائع ہونے کے لئے اپنی منظوم تخلیق پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں چاہے وہ دیوالی ہو یا محرم، کسی رہنما کا یوم ولادت ہو یا

www.taemeernews.com

سانحۂ ارتحال۔،اور بعض نے تو ایسا معلوم ہوتا ہے ان مواقع کے لئے نظمیں پہلے ہی سے لکھ کر رکھی ہوتی ہیں اور جوں ہی اُنہیں فرمائش یا موقع ملتا ہے وہ فوراً اسے پیش کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس معاملے میں عام شعراء کی اس ڈگر سے احتراز کرتے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو میرے خیال میں انہیں عام شاعروں کی صف سے الگ ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں مدد ملتی کیونکہ ہر بڑے شاعر میں انفرادیت تو ہوتی ہی ہے اور انہیں ان گنت شاعروں میں بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ میر و غالب ہوں یا اقبال و جوش۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

شرر فتح پوری

پیدائش: ۱۶؍مئی ۱۹۲۸ء، فتح پور پونڈری، کوروکشیتر (ہریانہ)

وفات: ۲۸؍نومبر کیتھل (ہریانہ)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ہریانہ کا ترقی پسند شاعر

شرر فتح پوری

''کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شرر فتح پوری اگر ساری زندگی اپنے آبائی قصبہ فتح پور (ہریانہ) میں نہ گزار دیتے، جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور ترکِ وطن کر کے دہلی یا بمبئی جیسے بڑے شہروں میں رہ پڑتے اور یہاں شہرت کے شہپروں پر اُڑنے کے انہیں وہی ذرائع بھی حاصل ہوتے جو دوسروں کو میسر ہوئے تو جدید شاعری کی تاریخ اور تذکروں میں اُن کا نام بھی نمایاں حروف میں لکھا جاتا۔''

مذکورہ بالا سطور اُردو کے ممتاز ناقد اور ادیب پروفیسر قمر رئیس نے آج سے تقریباً تین چار سال پہلے اُردو شاعر شرر فتح پوری کے بارے میں تحریر کی تھیں، جن کی ۲۶ر نومبر ۱۹۹۲ء کو کیتھل کے ایک ہسپتال میں وفات ہوگئی جہاں دورۂ قلب پڑنے پر دو دن پیشتر اُنہیں داخل کرایا گیا تھا۔

رام سنگھ المتخلص شرر ۱۶ر مئی ۱۹۲۸ء کو ہریانہ کے ایک گاؤں فتح پور میں پیدا ہوئے، انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ بی اے کی تعلیم کے لئے گاندھی میموریل نیشنل کالج انبالہ چھاؤنی میں داخل ہوئے اور یہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ

www.taemeernews.com

میں ہمارا تعارف ہوا۔ جلد ہی وہ اپنی پُر جوش اور شعلہ بار نظموں کی وجہ سے علاقے کے نمایاں و مقبول شاعر بن گئے اور اُن کا کلام ملک کے موقر و مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی بی اے کی تعلیم مکمل نہ کر سکے کیونکہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کی وجہ سے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے اور انہیں انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اُن کی روپوشی کے دوران بھی اُن کے جوش و جذبہ میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور انہوں نے اسی لب ولہجہ میں نظمیں تخلیق کی۔ کچھ مدت بعد وہ گرفتار کر لئے گئے اور اس طرح گاندھی میموریل نیشنل کالج انبالہ سے ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایڈ، ۱۹۵۵ء میں ایم ایڈ اور ۱۹۵۹ء میں ایم اے کی سند حاصل کی۔

بی ایڈ کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں اُنہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اپنا لیا اور ۱۹۵۶ء میں گوڑگاؤں میں محکمہ تعلیم میں تعینات ہو گئے۔ ۱۹۷۵ء سے ۳۱ مئی ۱۹۸۶ء تک وہ ہریانہ کے کئی اسکولوں میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمات انجام دیتے رہے اور پھر ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنے آبائی گاؤں فتح پور ہی میں گوشہ نشین ہو گئے۔

شرر کی لگ بھگ ایک درجن شعری تصانیف اُن کی زندگی میں منظر عام پر آئیں، جن میں سے سب سے پہلے اُن کی طویل نظم ''جنگ نہ ہونے دیں گے'' ۱۹۵۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد اُن کی مثنوی ''سازِ جمہور'' شائع ہوئی۔ مگر اس کے بعد دس سال کے طویل عرصہ میں اُن کی کوئی تخلیق اشاعتی مراحل سے نہیں گزری۔ پھر ۱۹۶۳ء میں ''ہمالہ جاگ اُٹھا'' کے عنوان سے اُن کی کچھ منظومات کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ پھر نو سال کے بعد کاروانِ سحر (مسدس) کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۸۱ء میں اُن کی منظوم تمثیل ''پدمنی'' اور آئندہ دو برسوں میں مثنویات کا مجموعہ ''نئی دنیا، نیا آدم' اور نظموں غزلوں کا مجموعہ ''فردا'' شائع ہوا۔ پھر

www.taemeernews.com

۱۹۸۶ء میں اُن کی نظموں کا مجموعہ ''حرف حرف'' اور ۱۹۸۷ء میں ایک ہی رنگ لہو کا'' منظرعام پر آیا۔ اُن کے مجموعہ کلام ''کہاں کی رباعی کہاں کی غزل'' کی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ ان کے علاوہ ہندی میں اُن کے دو مجموعے ''دھرتی کے گیت'' (۱۹۷۳ء) اور ''پدمنی'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آخر الذکر عنوان سے اُردو میں چھپی مثنوی ''پدمنی'' پر انہیں ہریانہ ساہتیہ اکادمی، اُتر پردیش اُردو اکادمی اور بہار اُردو اکادمی سے انعامات ملے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں انہیں ''نئی دنیا، نیا آدم'' پر بہار اُردو اکادمی سے اور ۸۷۔۱۹۸۶ء میں مجموعۂ کلام ''حرف حرف'' پر ہریانہ اُردو اکادمی اور ساہتیہ سبھا پونڈری نے انعام سے نوازا تھا۔ اسی طرح ۱۹۸۷ء میں انہیں نظموں کے مجموعے ''ایک ہی رنگ لہو کا'' پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی عطا کیا گیا تھا۔

یوں تو شرر کی ''پدمنی'' بھی جائسی کے ''پدماوت'' علاء الدین خلجی کے چتوڑ کے قلعے کا محاصرہ کرنے اور قلعے کے اندر رانی پدمنی اور دیگر راجپوت خواتین کی رسم جوہر ادا کرنے کے واقعات پر مبنی ہے لیکن یہ اپنے رنگ کی واحد مثنوی ہے جسے مکالمہ نگاری اور ڈرامائی عناصر نے بڑا دلکش اور دلپذیر بنا دیا ہے۔ اور عہد ماضی میں جہاں مثنوی کے لئے سات مخصوص بحروں کو ہی بروئے کار لایا جاتا تھا وہاں شرر نے بعض نئی بحروں کا استعمال کر کے اپنے لئے نئی ڈگر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں جہاں عام طور پر دیوؤں اور پریوں کے قصوں پر مبنی مثنویوں کو مقبولیت حاصل رہی ہے وہاں شرر نے ایک نیم تاریخی داستان کے زندۂ جاوید کرداروں کو اپنا کر خالص ہندوستانی پس نظر میں اس مثنوی کو پیش کیا ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس داستانِ پارینہ کے پس منظر میں عصری آگہی، جدید فکر و نظر اور امن و جنگ سے متعلق انسان کے اجتماعی شعور کی عکاسی کر کے اُسے عصرِ حاضر کی شئے بنا دیا ہے۔ اس کی فطری کردار نگاری، دل کش منظر نگاری، زبان کی شستگی و روانی اور خود کلامی کے موثر اسلوب نے اسے ایک کامیاب اور یادگار مثنوی بنا دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر جاوید

www.taemeernews.com

''بحروں کو تنوع پورے کلاسیکی آداب کے ساتھ شاعر کے ذوق جمالیات وشدت جذبات کا آئینہ ہے۔ زبان معیاری اور بیانِ پاکیزہ ہے۔ اُس پر مستزاد یہ کہ اس میں شاعر کا خلوص بھی شامل ہے۔ حالی پانی پتی کے معیارِ تنقید کے مطابق'' پدمنی'' میں سادگی، جوش اور حقیقت نگاری کی جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ شدت جذبات تو گویا اس منظوم رزمیہ تمثیل کا محور ہے اور جہاں تک ڈرامائی جذبات واحساس کا تعلق ہے یہ شاہکار نغمہ بار ڈرامائی ادب میں ہمیشہ تابندہ اختر کی طرح جگمگا تا رہے گا۔''

چتوڑ کا ذکر کرتے ہوئے شاعر اُس کے جیالوں اور جاں بازوں کی عکاسی یوں کرتا ہے۔

یہ خوں آفریں زندگی کا چمن
جیالوں کا آزاد فطرت وطن
جہاں جوشِ غیرت سے بیدار دل
وطن کی محبت میں سرشار دل
جنہیں ناز تھا اپنی تلوار پہ
جو رہتے تھے تلوار کی دھار پہ
دھنی بات کے قول کے پاسدار
وہ سینہ سپر بر سر کارزار
جو سر کاٹ کر خود ہتھیلی پہ لیں
جو تلوار کا زہر پی کر جئیں
کبھی پیٹھ پہ زخم کھایا نہ تھا
یہ بارِ ندامت اٹھایا نہ تھا

www.taemeernews.com

وہ بجلی کی صورت کڑکتے ہوئے
سر رزم اُٹھے گرجتے ہوئے
چلے آفتِ بے اماں کی طرح
بڑھے موجِ سیلِ رواں کی طرح
جدھر چل دئے راہ ہموار تھی
شریک سفر ایک تلوار تھی

''پدمنی'' کے علاوہ شرر نے کئی دیگر مثنویوں میں بھی اپنی فنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ ''سازِ جمہور'' ہو یا ''نیا زمانہ نیا ترانہ'' ہو، ''اے وطن اے میرے عزیز وطن'' ہو یا ''نئی دنیا، نیا آدم'' ہو، اُن کی ہر مثنوی میں حب الوطنی، عصرِ جدید کے مادی حالات وکوائف اور میلانات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ موجودہ دَور کی بیزاری وکرب ناکی اور انتشار واحتجاج کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کلاسیکی مثنوی کے انداز واسلوب کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اُن کا مطالعہ کرنے سے ہمارے عہد کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ایک جگہ امیری اور غریبی کے تضاد کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

کہیں جھونپڑوں میں دھواں ہے نہ آگ
کہیں کوٹھیوں میں گل افشاں ہیں راگ
کہیں زندگی خوں اگلتی ہوئی
کہیں رات ساغر، میں ڈھلتی ہوئی
کہیں آرزو بے کفن سرد لاش
کہیں خوب سے خوب تر کی تلاش

اس طرح شرر نے مثنوی کو اپنے ترقی پسند نظریات وخیالات کی تشہیر وتبلیغ کا وسیلہ بنایا ہے اور اسے اس مقام پر پہنچادیا ہے کہ دَورِ جدید کی مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے

www.taemeernews.com

اُنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

اس ضمن میں مثنوی ''نیا زمانہ نیا ترانہ'' کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کریں:

وطن آج کروٹ بدلنے کو ہے　　نئے ایک سانچے میں ڈھلنے کو ہے
ہے پُر پیچ راہوں کا لمبا سفر　　کہیں موڑ سیدھا کہیں پُر خطر
لپی اور بھاشا کی ان بن کہیں　　ہے صوبوں کی تقسیم پر رن کہیں
یہ مندر میں فتنے اُٹھائے ہوئے　　وہ مسجد میں فتنے جگائے ہوئے
اہنسا کے یوں تو پجاری ہیں یہ　　مگر دس بجھی اِک کٹاری ہیں یہ
نرے جھوٹ کے باندھتے ہیں یہ پُل　　کہ دھوکے کی ٹٹی سے دیتے ہیں جُل
وہ رہبر جو ہوں خود ہی بھٹکے ہوئے　　میانِ سفر ہوں جو اٹکے ہوئے
ہمیں راہِ منزل بتائیں گے کیا　　نشانِ رہ شوق پائیں گے کیا

مثنویوں میں کلاسیکی پختگی، عصری آگہی اور انقلابی فکر و خیال کی عکاسی کرنے والے شرر نے طویل نظموں میں بھی اپنے مزاج و افکار کی چھاپ چھوڑی ہے۔ اس طرح اُن کی نظموں بچے، مورخ، دیکھ رہا ہوں، مندر، ہیروشیما، دردِ وطن، انتظار، فردا اور پنگھٹ میں بھی عصری ادب کے تقاضے، زندگی کا پیغام اور فکر و احساس کی گہرائی پائی جاتی ہے اور یہ نظمیں اپنی گہرائی، گیرائی اور دل کشی سے قاری پر امٹ تاثرات چھوڑتی ہیں۔

نظموں کے علاوہ قطعات و رباعیات میں بھی شرر نے کلاسیکی روایات و اسلوب اور اپنے ترقی پسند نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے اور اُن میں بھی کوئی نہ کوئی پیغام پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے غزل جیسی اہم صنف کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ گو اس میں شک نہیں کہ وہ مجموعی طور پر نظم کے شاعر ہیں تاہم انہوں نے لاتعداد غزلیں کہیں جو اُن کے دو مجموعوں ''فردا'' اور ''حرف حرف'' میں شامل ہیں۔ ان غزلیات کے مطالعہ سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں ان غزلوں

www.taemeernews.com

میں بھی غزل کی کلاسیکی روایات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا ہے۔ بقول اُن کے:

میرؔ کا رنگ ِغزل سور کی بھگتی رس میں
خونِ تاثیر سے غالب کی نوا نس نس میں

اور

میرا نغمہ دلِ حیات کا درد
میری آواز وقت کی آواز

اس کے علاوہ ان کی غزلیات میں اُس دور کی آویزشوں کی جھلک بھی ملتی ہے اور روایتی موضوعات کو جدید انداز و اسلوب میں پیش کرنے کا فن بھی۔ اُن کی غزلوں میں روانی و شستگی بھی ہے اور دلکشی و دل پذیری بھی۔

اُن کے درج ذیل کچھ اشعار سے غزل پر ان کی فنی چابکدستی اور کلاسیکی رچاؤ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

اعتبارِ حیات کھو بیٹھے موت کتنی تھی معتبر اپنی

چہرہ کسی کا ہے تو یہ پیکر کسی کا ہے
پہچانئے کہ آدمی یہ کس صدی کا ہے

بارِ احساس سے جھکی ہیں آنکھیں
سر اُٹھے تو رُخِ قاتل دیکھوں

ڈوبنا ہی جو مقدر ٹھہرا
کیوں پلٹ کر کوئی ساحل دیکھوں

ہے نشیمن پر نگاہِ برق و باد میں کہاں جاؤں گلستاں چھوڑ کر

ہم پھٹے حالوں کی چادر ہے حیات
اس کو اوڑھیں کہ بچھائیں یارو

www.taemeernews.com

تو بچھڑ کر نہ ملا پھر اے دوست
یوں تو ملنے کو کائنات ملی

جو اپنی اپنی کہتے رہے ہوشمند تھے
سنتا رہا جو سب کی وہ شاید دوانہ تھا

بے حسی وہ ہے کہ اس دور میں جینے کا مزہ
نہ گناہوں میں رہا اور نہ ثوابوں میں رہا

قدموں کو چوم کر بھی وہ خار نظر رہا
سر چڑھ کے بھی عزیز، یہ قسمت ہے پھول کی

مختصراً یہ کہ شرر نے اپنی تمام زندگی اُردو شعروادب کی خدمت میں گزاردی اور اپنی مثنویوں، نظموں، رباعیات، قطعات، اور غزلیات سے اس میں قابلِ قدر اضافہ کیا لیکن ناقدینِ شعروادب کی توجہ اُن کی جانب جیسی ہونی چاہیے تھی، مبذول نہیں ہوئی۔ اب اگر مستقبل میں کبھی اُن کے فن پر کسی محقق یا ناقد نے توجہ دی تو وہی اُس کی صحیح قدر وافادیت کا تجزیہ کر سکے گا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

شورش کاشمیری

پیدائش: ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء، امرتسر (پنجاب)
وفات: ۲۴/ اکتوبر ۱۹۷۵ء لاہور (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

بیباک اور باضمیر شاعر

شورش کاشمیری

"میں قلم کو ہمیشہ ضمیر کی آواز پر اُٹھاتا ہوں۔ لہذا کسی لفظ پر اس لحاظ سے ندامت نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی مخفی اشارہ ہے۔ کسی ماں نے آج تک وہ بچہ ہی نہیں جنا جو میرے قلم و زبان کو خرید سکے۔ میرے نزدیک قلم فروشی عصمت فروشی سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی قبیح و مکروہ ہے۔ قدرت نے قلم اس لئے نہیں دیا کہ بیچا جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہاتھ شل ہو جائیں۔ زبان اس لئے نہیں بخشی کہ مرہونِ غیر ہو، ایسی زبان پر فالج گر جائے تو خدا کا احسان ہے۔"

مذکورہ بالا الفاظ برِصغیر کے بیباک صحافی و شاعر، شعلہ بیاں خطیب، تحریکِ آزادی کے مجاہد اور ہفت روزہ "چٹان" کے مدیر شورش کاشمیری کے ہیں جو انہوں نے جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں اسیری کے بعد رہا ہونے پر اپنے ہفت روزہ "چٹان" کے اداریے میں تحریر کئے تھے۔

www.taemeernews.com

شورش کاشمیری کا اصلی نام آغا عبدالکریم تھا لیکن اُن کا قلمی نام شورش کاشمیری اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اُن کا اصلی نام ہی بھول گئے۔ اور وہ آسمانِ سیاست و ادب پر لگ بھگ نصف صدی تک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی روشنی پھیلا کر آخر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

شورش کی پیدائش ۴/اگست ۱۹۱۷ء کو بمقام امرتسر ہوئی تھی جہاں تقسیم سے پیشتر کشمیریوں کی ایک بہت بڑی آبادی مقیم تھی۔ آغا حشر کاشمیری اور سعادت حسن منٹو کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ لیکن شورش کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزرا اور یہیں سے انہوں نے اپنی سیاسی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ برطانوی عہدِ حکومت میں انہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور پنجاب میں جگہ جگہ جا کر انہوں نے عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرح عوام کو انگریزی سامراج کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے تحریک و ترغیب دی۔

قیامِ پاکستان کے چند مہینے بعد یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو انہوں نے پاکستان کا تاریخ ساز ہفت روزہ ''چٹان' لاہور سے جاری کیا جو بہت جلد پاکستان کے عام و خاص طبقے میں اتنا مقبول ہوا کہ شورش سے اختلاف رکھنے والے بھی اسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ یہ پاکستان کا واحد ہفت روزہ تھا جس کا نصب العین یہ تھا کہ جس بات کو سچ سمجھو اسے بنا جھجھک کہہ ڈالو۔ اور اس نصب العین کے حصول کے لئے انہوں نے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں اور اپنی بات کہنے سے کبھی نہیں ہچکچائے۔ بقول شورش :

> ''چٹان ایک آزاد خیال ہفتہ وار ہے جس کا دل لوگوں کی اجتماعی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس کا ہمیشہ ہی یہ شعار رہا ہے کہ سیاسی مجاوروں ادبی نٹ کھٹوں، شرعی جیب تراشوں مجلسی قلندروں کا پردہ چاک کیا جائے۔ قیمت اس

www.taemeernews.com

اس کی خواہ کچھ ہی ادا کرنی پڑے۔ جب تک ان لوگوں کا
وجود باقی ہے اور چٹان بفضل تعالیٰ زندہ ہے، سیاسی عجائب
گھروں کی مورتیوں، ادبی بتکدوں کے کھلونوں اور منبر و
محراب کے آوارہ مصرعوں اور مجلسی روز بازار کے مہنتوں کی
باز پرس جاری رہے گی۔''

اور بلا شبہ شورشؔ نے زندگی بھر اپنے اس عہد کو نبھایا اور ہزار دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود انہوں نے چٹان کو جاری وساری رکھا اور کوئی بھی شخص ان کے قلم کو اُونچی سے اُونچی قیمت پر بھی نہ خرید سکا۔

شورشؔ کاشمیری کی تحریر وتقریر میں پائی جانے والی شدت اور انتہا پسندی زبان زد خاص وعام تھی۔ اُن کی خطابت سے لوگ اتنے متاثر تھے کہ کسی بھی شہر میں یہ اعلان ہونے پر کہ آج شورشؔ کاشمیری عوام کو خطاب کریں گے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اور تقریریں پڑھیں اور اُن کے اثرات کو اپنے اندر سمولیا اور اُن کی پیروی وتقلید کرنے لگے۔ انہیں مولانا آزاد سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اُن کے ممدوح ہی نہیں بلکہ اُن کے ''آئیڈیل'' بھی تھے۔ اور یہ شرف بھی اُنہیں ہی حاصل ہے کہ جب پاکستان میں مولانا آزاد کا نام لینے کی بھی لوگ جرات نہیں کر پاتے تھے انہوں نے لاہور سے ''چٹان'' کا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ ابوالکلام آزاد اور اُن کی تصنیف ''ترجمان القرآن'' کی دین ہے۔

مولانا آزاد سے انتہائی متاثر شورشؔ بھی اُن کی طرح تقریر وتحریر کی ایک غیر معمولی طاقت وصلاحیت رکھتے تھے اور وہ نوجوانی ہی میں میدان سیاست میں کود پڑے تھے اور مسلم قوم پرستوں کی سیاسی جماعت احرار سے منسلک ہو کر انہوں نے اپنی

www.taemeernews.com

تقاریر سے پنجاب کے گوشے گوشے میں اپنی جادو بیانی کے جوہر دکھائے اور عوام کو انگریز سامراج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دی۔

قیام پاکستان کے بعد نئے ملک میں بساطِ سیاست ہی بدل گئی اور وہ جنرل ایوب خان کے فوجی راج میں پاکستان میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھانے والوں میں پیش پیش رہے۔

شورش اُردو صحافت میں ایک منفرد ہستی تھے۔ انہیں تحریر و تقریر دونوں پر دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک شعلہ بیاں مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و سخن میں بھی ایک انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کو اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں کتابی شکل بھی دی۔ ''اپنی تصنیف فنِ خطابت میں انہوں نے اپنے شعلہ بیانی کے تجربات کو بھی بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کیا۔ تحریک ختمِ نبوت کے سلسلے میں انہوں نے جو قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں ان کو'' جیل سے واپسی'' نامی کتاب میں محفوظ کیا۔ اور حجازِ مقدس کے سفر نامے کو بڑے دلچسپ انداز و اسلوب میں ''شب جائے کہ من بودم'' کے نام قلمبند کیا۔ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات وحوادث کو ''بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل'' میں بڑے مسحور کن اسلوب میں پیش کیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گفتنی و ناگفتنی'' اشاعت پذیر ہوا تھا اور اس کے بعد ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ اُن کی دیگر کتابوں میں چہرے، اس بازار میں، تمغۂ خدمت، فیضانِ اقبال، تحریک ختمِ نبوت، چہ پس دیوارِ زنداں، قلندرانہ گفتم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جنرل ایوب خان کے برسرِ اقتدار آتے ہی پاکستانی عوام کے جمہوریت کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ملک میں فوجی راج قائم ہو جانے سے عوام کی آواز بالکل دب کر رہ گئی۔ اُس دور میں ۲۲ر جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شورش نے ایوب کے چغہ برداروں اور خوشامدیوں کے بارے میں اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ:

www.taemeernews.com

''اپوزیشن کی بدولت سرکار کے سیاسی لنگر میں ان لوگوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے ورنہ ان کا وجود ہی خطرناک ہے یہ لوگ سرکار کے دروازہ پر مچھندروں کی طرح صدا دیتے اور اپوزیشن کے فرضی خطرے پر سانڈوں کی طرح پلتے ہیں''۔

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ جنرل ایوب کے عہدِ حکومت میں اس قسم کے لوگ اُن کے اردگرد جمع ہو گئے تھے جن کا پاکستان کی تحریک کے دنوں میں کوئی خاص رول نہیں تھا، جن کا کوئی قومی کردار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ وہ تو صرف چڑھتے سورج کے پجاری تھے۔ وہ لوگ خوشامد کی اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ خوشامد بھی اُن سے شرماتی تھی۔ بنیادی جمہوریت کا نظام اکثر و بیشتر ایسے خودغرض افراد کے ہاتھوں میں تھا جو اپنے معمولی سے فائدے کے لئے ہر قومی مفاد کا سودا کر سکتے تھے۔ کلام اللہ کی جھوٹی قسمیں کھانا اُن کا شعار ہو گیا تھا۔ ان کی ایسی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے اس دور میں شورش نے اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا۔ ''قرآن سستا اور مرغ مہنگا ہو گیا ہے'' ان ہی خوشامدی اور چاپلوس حواریوں کی وجہ ہی سے ایوب نے اپنے آپ کو ایک ایسی قوت سمجھ لیا جو اپنی فراست کے بجائے اپنی ذات پر بھروسہ کرتی تھی۔''

شورش وطن عزیز کی آزادی و خوشحالی کے لئے قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کرتے رہے مگر افسوس جب ملک کو انگریزی سامراج سے نجات ملی تو ملک میں نااہل، خودغرض اور ابن الوقت سیاست دانوں اور حکمرانوں کا تسلط ہو گیا اور پھر فوجی آمریت نے ان کے خوابوں کے محل چکنا چور کر دئے۔ اس ناگفتہ بہ بحرانی صورتِ حال میں اُن کے دل میں غم و غصہ کا لاوا اُبل پڑا اور انہوں نے اپنے خیالات و جذبات کو اپنے اشعار میں یوں منتقل کیا:

www.taemeernews.com

ہم نے اُس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سر فروشوں کے لئے دار و رسن قائم تھے
خان زادوں کے لئے مفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں
خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں
رہنماؤں کے لئے حکمِ زباں بندی تھا
جرمِ بے جرم کی پاداش میں زنجیریں تھیں
حیف اب وقت کے غدّار بھی رستم ٹھہرے
اور زنداں کے سزاوار فقط ہم ٹھہرے

صدر ایوب بھی شورش کی اس طرح کی تقریر و تحریر سے بے حد خائف رہتے تھے اور انہوں نے انہیں اپنے خیمے میں شامل کرنے کے لئے کئی لالچ دیئے اور دھمکیاں بھی لیکن اُن پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا حتیٰ کہ بلآخر انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر پھر بھی وہ نہ ٹوٹے یہاں تک کہ اپنی رہائی کے بعد بھی اپنے اداریے میں انہوں نے لکھا۔

''مَیں نے جو کچھ لکھا وہی لکھا جو خود محسوس کیا۔ مَیں زبان و بیان میں ٹھوکر کھا سکتا ہوں لیکن ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ آواز اُس کی اپنی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو قلم کا کاروبار کرتے ہیں مَیں انہیں ''شرالدّواب عنداللہ'' سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ تمام ادیب، شاعر، صحافی، واعظ، مقرر اور خطیب بالا خانوں کی مخلوق ہیں جنہوں نے جوہرِ قلم اور جوہرِ زبان کو بازار کی جنس بنا دیا ہے۔''

www.taemeernews.com

وہ اپنی پوری زندگی میں کسی ڈکٹیٹر یا حکمران کی دھمکی یا وارننگ سے خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ ان کے حوصلے اور استقلال میں مزید اضافہ ہوا۔ ایک بار گورنر جنرل محمد موسیٰ خاں نے انہیں سخت الفاظ میں تنبیہ کی تھی کہ وہ قادیانیوں کے خلاف لکھنا بند کردیں، جس پر انہوں نے جواب دیا تھا کہ۔ ''مرنے کے بعد مَیں حضور اکرم ﷺ کے سامنے کس منہ سے پیش ہوں گا کہ ان کی غلامی کا دعویٰ کرنے کے باوجود ختم نبوت کا جھنڈا بھی نہ اُٹھا سکا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کردی تھی اور ان کی حالت تشویشناک ہوگئی تھی تو اس وقت کے گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر نے انہیں بعض قریبی دوستوں کے توسط سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کا پیغام ارسال کیا تھا جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ..... ''کھر کی پوری حکومت مل کر بھی مجھے تو کیا، میری ایک انگلی کو بھی نہیں جھکا سکتی۔''

بعد ازاں شورش اور ایوب راج کے مخالفین نے ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ دیا اور یوم حمید نظامی پر بھٹو کو پلیٹ فارم مہیا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور میں منعقد اس جلسے میں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ حکومت کی پریشانی کا باعث بنی لیکن حکومت کے خوف سے اخباروں نے اسے کورج (Coverage) دینے سے اجتناب کیا لیکن ''چٹان'' کے آرٹ پیپر کے سرورق پر بھٹو کے سواگت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ مذکورہ شمارے کی متعدد کاپیاں خرید کر بھٹو نے بعض امریکی وقائع نگاروں کو نذر کیں۔ حتیٰ کہ اس کی کاپیاں کئی غیر ممالک میں بھی بھیجی گئیں۔

افسوس کہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو صرف ۵۸ سال کی عمر میں ہی یہ نڈر اور بیباک خطیب اور ہر قیمت پر صحافت کی عزت و آبرو قائم رکھنے والا صحافی، جس کے قلم کو نہ تو حکومت کا جبر خرید سکا اور نہ ہی دولت ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔ ان کے سانحۂ ارتحال سے پاکستان کے سبھی حلقوں میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ ان کے

www.taemeernews.com

مخالفین نے بھی ان کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو اُن دنوں غیر ملکی دورے پر تھے مگر جوں ہی وہ اپنے دَورے سے واپس پاکستان پہنچے تو تعزیت کے لئے اُن کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے اور بعدازاں فاتحہ پڑھنے اُن کی قبر پر۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پیشتر بھٹو شاید کسی اور صحافی یا سیاست داں کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے نہیں گئے تھے۔

آج شورشؔ لاہور کے قبرستان 'میانی صاحب' میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہیں لیکن ان کی جوش و ولولہ سے بھری تحریریں اور تقریریں ملک کے عوام کی بیداری کا آج بھی ایک وسیلہ و منبع ہیں اور جب بھی وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ان میں جوش و خروش کا ایک بحرِ بیکراں امنڈ پڑتا ہے اور وطن عزیز کی آزادی و تحفظ کے لئے ان کے دل میں ایک نئی امنگ..... ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے کردار و عمل کی باتیں اور داستانیں انہیں رہ رہ کر یاد آنے لگتی ہیں۔ کسی شاعر نے سچ ہی کہا تھا کہ:

یاد کرتا ہے زمانہ ان ہی انسانوں کو
روک دیتے ہیں جو بڑھتے ہوئے طوفانوں کو

☆☆☆

www.taemeernews.com

صابر دت

پیدائش: ۹ر ستمبر ۱۹۳۸ء میر پور (جموں وکشمیر)

وفات: ۳ر فروری ۱۹۹۹ء ممبئی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

صابر دت

چند تاثرات

صابر دت کی وفات کے سات سال بعد آج ہم انہیں یاد کرنے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔اس لئے مَیں بھی اُن کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ اُن سے نہ تو میری کبھی دوستی رہی ہے اور نہ کبھی قربت۔ہاں ایک بار زندگی میں ہریانہ ہاؤس نئی دہلی کے گیسٹ ہاؤس میں اُن سے ایک مختصر سی ملاقات ضرور ہوئی تھی جہاں وہ کشمیری لال ذاکر صاحب کے ساتھ قیام پذیر تھے۔اس کے علاوہ ایک دو بار ''چند تصویرِ بتاں'' کی ترتیب وتدوین کے دوران کچھ تصویریں فراہم کرنے کے سلسلے میں انہوں نے مجھے خطوط لکھے تھے۔بس اس سے زیادہ ہمارا آپس میں کبھی کوئی ربط یا تعلق نہیں رہا۔لیکن اس کے باوجود مَیں نے اُن کی زندگی اور تاریخ ساز ادبی کارناموں کے بارے میں اتنا کچھ پڑھا اور سُنا ہے کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مَیں صابر دت کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔

صابر دت جن دنوں دہلی سے دیوناگری رسم الخط میں ''روپ'' اور پندرہ روزہ ''دِلی والا'' نکالتے تھے اور دہلی کے کافی ہاؤس میں محفلیں سجایا کرتے

www.taemeernews.com

تھے، اُن دنوں دہلی میں رہتے ہوئے بھی میری کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اُن کے دہلی کو خیر باد کہہ دینے کے بعد جب کبھی کبھار کافی ہاؤس جانا ہوا تو کچھ لوگ اُن کا ذکر اس انداز سے کرتے کہ مجھے ناگوار گزرتا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ''دت'' تھے اور اگرچہ میں اپنے نام کے ساتھ ''دت'' کا استعمال نہیں کرتا تاہم مَیں بھی موہیال براہمنوں کے اسی ''دت'' خاندان کا ایک فرد ہوں جس سے صابر دت تعلق رکھتے تھے۔

موہیال براہمنوں کے بارے میں شاید عام لوگ کچھ زیادہ نہ جانتے ہوں مگر تقسیم سے پیشتر یہ لوگ زیادہ تر پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد اور افغانستان میں آباد تھے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ براہمن ہوتے ہوئے بھی دان نہیں لیتے تھے اور اُن کا پیشہ کاشتکاری یا فوج اور پولیس میں ملازمت تھا اور عہدِ انگریزی میں اُن کا شمار مارشل قوموں میں ہوتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ ان ہی تین پیشوں سے وابستہ رہے ہیں اور آج بھی ہمارے لاتعداد افراد فوج سے وابستہ ہیں۔ جن میں سپاہی اور حوالدار سے لے کر جنرل تک کے عہدے پر فائز حضرات شامل ہیں۔

صابر دت کی ولادت ۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو ریاست جموں و کشمیر میں بمقام میر پور ہوئی اور والدین نے اُن کا نام کُل بھوشن رکھا۔ اُن کے والد بھی اپنے روایتی پیشے پولیس سے وابستہ تھے اور وہ میر پور میں پولیس افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ جب قبائلیوں نے ریاست پر حملہ کیا تو انہوں نے انہیں بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیا۔ یہ روح فرسا منظر آٹھ سالہ کمسن کُل بھوشن نے اپنی والدہ کے ساتھ جھاڑیوں میں روپوشی کی حالت میں دیکھا مگر وہ آہ تک نہ بھر سکا۔ کیونکہ اُس کی ماں نے اُس کے اور اُس کی ننھی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا تاکہ اُن کی چیخ یا آہ و بکا سے وہ بلوائیوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں۔ اُن کی جان تو بچ گئی لیکن وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر اور اپنے والد کی ہلاکت کو وہ کبھی نہیں بھولا۔ بقول فکر تونسوی:

www.taemeernews.com

''کبھی کبھی مجھے شک ہوتا ہے کہ صابر دت کے
اندر بولتا ہوا معصوم بچہ اپنے باپ کی تلاش میں بھٹکتا پھر
رہا ہے۔ وہ ہر ایک کی گود کی طرف معصوم اور پیاسے
بچے کی طرح دیکھتا ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے، اسے باپ کی
شفقت نصیب نہیں ہوئی اور شفقت کی یہی پیاس اُسے
کنوئیں کنوئیں بھٹکاتی پھری ہے۔ جس کنوئیں سے چلو بھر
محبت اُسے مل جائے وہ اُس سے اپنی پیاس بجھالیتا ہے۔''

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ فرقہ واریت کا شکار ہونے کے باوجود اُن کے دل میں ردِعمل کے طور پر فرقہ وارانہ یا مذہبی تعصبات کے جذبات کبھی نہیں اُبھرے بلکہ اس کے برعکس فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کے جذبات موجزن رہے۔ وہ اُن خونی مناظر کو کبھی نہیں بھولے اور وہ ہمیشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے بائیسکوپ کی تصاویر کی مانند گھومتے رہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں بھی ان مناظر کی تصویر کشی کی جیسے:

پھول جو بھی تھا زخمِ دل نکلا　　کیسے عزت لٹی بہاروں کی

یقیں ہو کیسے کہ گلشن میں آ گئی ہے بہار　　ابھی ابھی تو نشیمن جلا کے آیا ہوں

حاکم شہر کا کرم دیکھو　　آدمی آدمی کا قاتل ہے

صابر دت کی زندگی کے مطالعے سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کی زندگی تگ و دو کی کہانی ہے۔ وہ نامساعد حالات کا شکار رہے اور انہیں محرومیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر وہ ممبئی نہ جاتے اور انہیں ساحر لدھیانوی ایسے دوست اور ہمدرد نہ ملتے تو شاید وہ صرف ایک عام شاعر اور صحافی کے علاوہ کچھ نہ ہوتے۔ مگر ''فن اور شخصیت'' کے اجراء اور اُس کے ضخیم خصوصی نمبر نکال کر انہوں نے جرائد کی دنیا میں ایسا تہلکہ مچایا کہ کوئی انہیں ہندوستان کا ''محمد طفیل'' کہنے لگا تو کوئی

www.taemeernews.com

دَورِ جدید کا ''بابائے صحافت''۔ یہاں تک کہ جب مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر پر انہوں نے خصوصی نمبر شائع کیے تو اتفاق سے اُن حضرات کی وفات ہوگئی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس پر کسی نے ایک محفل میں مذاقاً کہا کہ صابر دت جس کسی پر نمبر نکالتے ہیں وہ اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے، اس پر ایک ممتاز و نامور ادیب نے کہا تھا کہ ''اگر صابر دت مجھ پر اتنا خوبصورت نمبر نکالیں تو مَیں مرنے کو تیار ہوں'' بھلا اس سے بڑھ کر اُن کی مدیرانہ صلاحیت، نفاست اور سلیقے کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟۔ اور اس میں رتی بھر بھی مبالغہ نہیں کہ اُردو رسائل و تحقیق کی دنیا میں ''فن اور شخصیت'' کے خصوصی نمبروں کی بدولت صابر دت کو بھی نقوش لاہور کے محمد طفیل کی طرح کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

لیکن صابر دت ایک اچھے مدیر ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''پل دو پل'' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اور پھر ۲۷ سال بعد اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''موجِ عارض'' اشاعت پذیر ہوا۔ ان مجموعوں کی اچھی پذیرائی ہوئی مگر شاید ان کی مدیرانہ صلاحیتوں نے اُن کی شاعرانہ خوبیوں کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور انہوں نے اپنے سماج اور عہد کی اپنی شعری تخلیقات میں بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔ باوجود یہ کہ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کہیں کہیں اُس دَور کے ترقی پسند شعراء ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور مخدوم محی الدین کے افکار و انداز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مگر یہ کوئی عیب نہیں۔ عموماً ہر ادیب اپنے ہم عصروں اور متقدمین سے متاثر ہوتا ہے اور ان کے اسلوب و افکار سے خوشہ چینی بھی کرتا ہے اور انہیں اپنے انداز سے تخلیقی جامہ پہنا کر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اس سے جب غالبؔ جیسا عظیم شاعر بھی دامن نہیں بچا سکا تو دوسرے شاعروں کو الزام کیوں دیں؟ بہر حال صابر دت نے اپنے پہلے شعری مجموعے سے ہی اُردو قارئین کو

www.taemeernews.com

اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ اُن کی ابتدائے عشق کی رومانیت دھیرے دھیرے سنجیدگی اختیار کر کے بالآخر عصری حسیت میں تبدیل ہوگئی۔ اُن کے کلام میں ہمارے سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی وعکاسی کی گئی ہے اور اس میں ہمارے سماج کی باغی اور غیر مطمئن نوجوان کے افکار ونظریات اور اُس کے سنہری خوابوں کی شکست وریخت کی آواز سنائی دیتی ہے جو ایک نئی دنیا بسانے اور بوسیدہ سماج کو بدلنے کا ہی آرزومند نہیں بلکہ اُس سے ٹکر لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ انہوں نے کچھ ایسی عمدہ شعری تخلیقات بھی عطا کی ہیں جنہیں قاری اور نقاد نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' شہرت کے لحاظ سے اُردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے تاہم صابر دت نے بھی اپنی اس نظم میں ایک نیا انداز اور طرزِ فکر اپنا کر اسے منفرد حیثیت عطا کر دی ہے۔ اس نظم کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جن کی مہک کبھی پھیکی نہیں پڑے گی۔ جیسے ''روشنی'' ''وقت'' ''نقشِ پا''، ''میرا سفر''، ''اجنبی'' ''لاوارث'' ''میری غزل'' اور ''گاؤں کی صبح'' وغیرہ۔ نیز متعدد ایسے اشعار ہیں جو ان کی انفرادی پہچان کے آئینہ دار ہیں اور قاری کے دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں جیسے:

ہم نے دیکھی تو نہیں رسمِ وفا آپ کہتے ہیں تو اچھی ہوگی

☆

بے چراغ گلیوں میں مشعلیں ہوئیں روشن کون لوگ آئے ہیں میرا گھر جلانے کو

☆

پڑھ رہے ہیں وہ نماز ایسے جیسے سجدہ خُدا خُدا کو کرے

☆

جانے کیا خوف تھا کہ قاتل کا ہاتھ تلوار تک نہیں پہنچا

☆

www.taemeernews.com

صحنِ گلزار میں جس پیڑ کے پھل میٹھے تھے ہم نے اُس پیڑ کی تقدیر میں پتھر دیکھے

☆

ترکِ تعلقات کا پہلو نکل نہ آئے رہتے ہیں اپنے ساتھ بھی بیگانگی سے ہم

☆

صرف تاریخ میں دو نام حسین اور یزید جنگ کوئی نہیں حق و باطل کے سوا

☆

کچھ دوستی میں کٹ گئے کچھ دشمنی کے ساتھ دو چار روز جینے کی مہلت ملی مجھے

☆

گاؤں سے شہر نیا تھا لیکن سارے وہ درد پرانے نکلے

ایسے دل کو چھو لینے والے اشعار کے باوجود خدشہ ہے کہ اُن کی شاعری وقت کی گرد اور دَورِ حاضر میں شائع ہونے والے ان گنت شعری مجموعوں کے انبوہ کثیر میں دب کر رہ جائے گی اور شاید بحیثیت شاعر اُردو ادب میں ان کی پذیرائی نہ ہو لیکن ''فن اور شخصیت'' ایسے تاریخ ساز مجلّے کے ضخیم اور یادگار خصوصی نمبروں کی بدولت انہوں نے تاریخ اُردو ادب میں ایسا مقام حاصل کر لیا ہے کہ اُن کے ذکر کے بغیر اُردو رسائل کی تاریخ کبھی مکمل ہی نہیں ہو پائے گی۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

قرۃالعین حیدر

پیدائش: ۲۰؍جنوری ۱۹۲۶ء علی گڑھ (اُتر پردیش)

وفات: ۲۱؍اگست ۲۰۰۷ نوئیڈا (اُتر پردیش)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

عینی آپا

چند ذاتی تاثرات

فراقؔ گورکھپوری نے اپنے بارے میں کہا تھا ؎

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہمعصرو!
اُن کو جب معلوم یہ ہوگا تم نے فراق کو دیکھا تھا

اور بلاشبہ یہ بات اُن لوگوں کے لئے باعث فخر ہے جنہوں نے فراقؔ ایسے عظیم المرتبت شاعر کو دیکھا تھا۔ مگر یہی بات شہرہ آفاق اُردو فکشن نگار قرۃ العین حیدر پر بھی صادق آتی ہے جن کی ۲۰ر اور ۲۱ر اگست کی درمیانی شب کو رات ساڑھے تین بجے نوئیڈا کے کیلاش ہسپتال میں وفات ہوگئی کیونکہ اُن کے پرستار اور معتقد صرف برصغیر ہندو پاک میں ہی نہیں ساری اُردو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے انتقال پر ہر ادیب اور شاعر اُن سے اپنی سرسری سی ملاقات یا گفتگو کو باعث افتخار سمجھتے ہوئے بڑی تفصیل سے بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا اور ساتھ ہی بیان کرتے ہوئے فخر سے اُس کا سینہ تن جاتا ہے جیسے وہی واحد شخص ہے جس نے انہیں دیکھا یا اُن سے ملنے کا شرف حاصل کیا تھا۔

اور یہ بات ہے بھی فطرتی کہ جب کوئی آدمی شہرت کے بام عروج پر پہنچ

www.taemeernews.com

جاتا ہے تو ہر کوئی اُس سے اپنے معمولی سے رشتے یا واقفیت کو بڑھا چڑھا کر یوں بیان کرتا ہے جیسے صرف وہی اُس کے بہت قریبی رہا ہو۔ چاہے وہ اُسے معمولی سا ہی کیوں نہ جانتا ہو۔

مشہور ہے کہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد پنجاب خصوصاً لاہور کے اکثر باشندے اُن سے اپنی دیرینہ ملاقات اور رشتے کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتے تھے چاہے اُن کے ساتھ اُن کی کوئی قربت رہی بھی نہ ہو۔ اس سلسلے میں معروف مزاح نگار ابراہیم جلیس نے برسوں پہلے ایک مزاحیہ مضمون یا انشائیہ لکھا تھا کہ لاہور میں جس سے ملئے وہ باتوں ہی باتوں میں یہ تذکرہ ضرور کرے گا کہ وہ علامہ اقبال کو بہت قریب سے جانتا ہے۔ یہاں تک کہ حجام اور اور تانگے والے بھی بڑے فخر سے علامہ اقبال سے اپنی برسوں کی واقفیت کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ جیسے کہ اگر آپ لاہور کے کسی تانگے میں سوار ہوں اور آپ گھوڑے کی تعریف کر دیں بس پھر کیا ہے؟ کوچوان بڑے فخر سے کہے گا۔ ارے صاحب! یہ گھوڑا تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی بہت پسند تھا اور وہ ہمیشہ میرے ہی تانگے پر کچہری جایا کرتے تھے۔ چاہے وہ ایک بار ہی اس تانگے پر سوار ہوئے ہوں۔ اسی طرح کسی نے لاہور کے ایک نائی کو اُلٹے اُسترے سے حجامت کرنے سے منع کیا۔ تو اُس نے فوراً کہا جناب مَیں نے تو اُس دن سے اُلٹے اُسترے سے حجامت کرنے سے توبہ کر لی تھی جس دن علامہ اقبال نے، جو میرے ہاں ہی حجامت کرانے آتے تھے، مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ میاں اُلٹے اُسترے سے حجامت مت کیا کرو۔

اسی طرح عینی آپا سے بھی آج ہر فرد اپنی قربت اور نزدیکی کے قصے بیان کرتا پھرتا ہے۔ لیکن کیوں نہ ہو؟ وہ ہمارے دَور کی ایک **لیجنڈ** (Legend) تھیں۔ وہ اُردو کی عظیم فکشن نگار تھیں اور انہوں نے ''آگ کا دریا'' ایسا لازوال اور معرکتہ الآرا ناول لکھ کر اُردو دنیا میں ابدی شہرت حاصل کر لی تھی جو بہت کم ادیبوں کے حصے میں

www.taemeernews.com

آئی ہے۔اس لئے اُن سے بھی اپنے رشتوں اور ملاقاتوں کا تذکرہ کرنا قدرتی امر ہے اور بلا شبہ یہ بات اُن افراد کے لئے باعث افتخار بھی ہے جنہوں نے اُردو کی اس **لیجنڈ** کو دیکھا ہے اور جہاں تک میرا معاملہ ہے، مَیں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے عینی آپا سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔

مَیں نے ۱۹۶۴ء میں وزارت اطلاعات ونشریات کے محکمہ پبلی کیشنز ڈویژن کے تحت شائع ہونے والے ماہنامہ ''آج کل'' کو بحیثیت سب ایڈیٹر جوائن کیا تھا جبکہ اس کے ایڈیٹر عرش ملسیانی صاحب تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر شہباز حسین صاحب۔مَیں اس رسالے سے کوئی پندرہ سال تک وابستہ رہا اور اس طویل المدتی وابستگی کے دوران مجھے بہت سے مشہور ومعروف ادباء وشعراء کو دیکھنے، سننے اور ملاقات کرنے کا موقع ملا جن میں جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، حفیظ جالندھری، جوشؔ ملسیانی، ساغرؔ نظامی، پروفیسر کلیم الدین احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بسملؔ سعیدی، جمیلؔ مظہری، سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عینی آپا کو پہلی بار مجھے ۱۹۷۲ء میں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا جب وہ مہدی عباس حسینی، ایڈیٹر آج کل کے زمانے میں پٹیالہ ہاؤس تشریف لائی تھیں جہاں ان دنوں مذکورہ رسالے کا دفتر واقع تھا۔اُن دنوں ''آگ کا دریا'' کی وجہ سے اُنہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی اور ہر ادبی محفل مین اُن کا ذکرِ خیر ہوتا تھا۔اور مَیں تو اُن کا مذکورہ ناول پڑھ کر اُن کا معتقد و پرستار بن چکا تھا۔حالانکہ جب شروع شروع میں ۴۷۔۱۹۴۶ء میں مَیں نے اُن کا نام سُنا تھا تو اُن کی شہرت سجاد حیدر یلدرم کی بیٹی کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ابتدا میں اُن کی تحریروں سے قاری زیادہ متاثر نہیں ہوئے اور اُس دَور میں اُن کے انگریزی الفاظ کے کثرت سے استعمال کے کارن اُن کی تحریر کا مذاق بھی اُڑایا گیا تھا۔ان کی ابتدائی کہانیوں میں مشنری کانونٹ اسکول کا ماحول..... بائیبل کی دعائیں،..... انگریزی گیتوں اور نظموں کے پیرے کے پیرے پائے

www.taemeernews.com

جاتے تھے۔خود انہوں نے اس ضمن میں تحریر کیا تھا کہ اُن کی ایک کہانی کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ایک خاتون نے انہیں کہا تھا کہ آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں۔

پھر جب ان کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' منظر عام پر آیا تو اُس نے ادبی دنیا میں اُن کی شناخت بدل دی۔اور اس ناول کی تعریف بھی ہوئی اور بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں، حتیٰ کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی اس پر ایک طویل مضمون لکھا۔مگر اُن دنوں بھی انہیں کرشن چندر کا مذکورہ ناول پر تبصرہ پڑھ کر بے حد کوفت ہوئی کیونکہ بقول ان کے۔''ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی اور کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا کہ اس ناول میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں'' اُس کے بعد جب اُن کا تاریخ ساز ناول ''آگ کا دریا'' شائع ہوا تو پورے برصغیر میں اس کی دھوم مچ گئی۔تاہم کچھ ادبی حلقوں نے اس کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی اور اسے اتنا متنازعہ بنا دیا کہ انہیں پاکستان میں رہنا دشوار ہو گیا۔اسی دوران پاکستان میں جنرل ایوب خاں نے مارشل لاء لگا کر پاکستان میں ایسا ماحول بنا دیا کہ عام آدمی کا جینا دوبھر ہو گیا۔ایسے میں قرۃ العین حیدر کا پاکستان کی اس فضا میں دم گھٹنے لگا اور وہ ۱۹۶۱ء میں پاکستان کو الوداع کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان آ گئیں۔

اگر چہ ''آگ کا دریا'' کی اشاعت سے پہلے اُن کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' سے اُن کی ایک بحیثیت ناول نگار کچھ شناخت بن چکی تھی مگر ''آگ کا دریا'' کے منظر عام پر آنے سے چاروں طرف اس ناول کا تذکرہ بڑے زور شور سے ہونے لگا اور ہر طرف بحیثیت ناول نگار اُن کی تعریف و توصیف ہونے لگی، اُن کے ناول پر بے شمار مضامین لکھے گئے اور ایک عظیم فکشن نگار کے طور پر وہ ادبی دنیا کی فضا پر چھا گئیں۔

عینی آپا کا ماہنامہ ''آج کل'' سے پرانا تعلق رہا تھا۔اُن کا ایک افسانہ ''دوسرا کنارہ'' یکم جون ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا جب کہ یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا اور اس کے

www.taemeernews.com

مدیر تھے مشہور محقق اور نقاد سید وقار عظیم۔ اور اب پچیس سال بعد وہ ''کار جہاں دراز ہے'' کی اشاعت کے سلسلے میں مہدی عباس حسینی صاحب سے بات چیت کرنے کی غرض سے آئی تھیں جس کی پہلی قسط ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور آخری قسط مارچ ۱۹۷۶ء میں۔ اس دوران وہ کئی بار دفتر آئیں اور کئی کئی گھنٹے بیٹھی رہیں۔ اُن دنوں ساغر نظامی صاحب بھی پبلی کیشنز ڈویژن میں جنگ آزادی کی منظوم داستان لکھنے کی غرض سے مامور تھے۔ اور اُن کا کمرہ بھی ہمارے کمرے کے پاس تھا۔ لہذا وہ بھی لنچ ہمارے ساتھ ہی کرتے تھے۔ کئی بار عینی آپا بھی اس میں شریک ہوئیں اور موسم سرما کے دنوں میں چند بار اُن کے ساتھ پٹیالہ ہاؤس کے سامنے واقع لان میں بیٹھ کر مونگ پھلی اور چنے کھانے کے ساتھ ساتھ دھوپ سینکنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

پہلی بار جب وہ آئیں تو آفسیٹ پر شائع ہونے کی وجہ سے 'آج کل' میں ادباء و شعراء کی تصاویر بھی چھاپی جاتی تھیں۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ ''کار جہاں دراز ہے'' کی پہلی قسط کے ساتھ اُن کی وہی تصویر چسپاں کی گئی ہے جو کئی برس پہلے نقوش لاہور میں شائع ہوئی تھی اور جو اکثر اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی تھی تو وہ کچھ برہم سی ہوگئیں اور سخت لہجے میں بولیں کہ ''یہ مینا کماری ٹائپ کی تصویر اس کے ساتھ مت چھاپئے' لہذا مضمون کے پہلے صفحے پر چسپاں کی گئی مذکورہ تصویر ہٹالی گئی حالانکہ تصویر ہٹانے کے کارن پہلے صفحے کا Balance کچھ خراب بھی ہوگیا۔ بہر حال اس کے بعد وہ تصویر کبھی آج کل میں شائع نہیں کی گئی۔

ایک بار انڈیا گیٹ کے لان میں بیٹھے ہوئے انہوں نے بتایا تھا کہ اُن کے ناول ''آگ کا دریا'' کا کسی سلامت علی مہدی نامی شخص نے جعلی ایڈیشن چھاپا تھا۔ اور کچھ دن پہلے وہ شمع کے دفتر میں گئیں تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ صاحب اسی دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اس پر انہوں نے ان سے اس کی شکایت کرنے کے لئے انہیں کمرے میں بلوایا۔ سلامت علی مہدی کے کمرے میں آنے پر جب انہوں نے ان سے

www.taemeernews.com

شکایت کی کہ انہوں نے بغیر اجازت کے ان کا ناول کیوں شائع کیا ہے تو وہ صاحب معذرت کرنے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے بولے۔ جی ہاں میں نے اسے چھاپا ہے۔ آپ جو چاہیں کر لیں۔ اس پر انہیں غصہ تو بہت آیا مگر وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔ تاہم وہ اُن کی بدتمیزی کو کبھی فراموش نہ کر پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے سرکاری طور پر ہندوستان میں جعلی کتابوں کے مسئلے کو اُٹھایا اور کچھ اعلیٰ افسران کو اس سلسلے میں خطوط بھی لکھے جس کے نتیجے میں دہلی کے کئی ناشروں کے ہاں چھاپے بھی پڑے۔ اور کچھ حد تک پاکستانی کتابوں کے جعلی ایڈیشنوں کا سلسلہ بند سا ہو گیا۔

ان ہی دنوں ایک بار وہ دفتر آئیں تو لنچ کے دوران جب ہم لوگ پٹیالہ ہاؤس کے سامنے انڈیا گیٹ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے بڑے مزے لے لے کر ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ گزشتہ دنوں وہ سرکاری دعوت پر اُتر پردیش کی قدیم اور تاریخی عمارتوں کو دیکھنے گئی تھیں اور ایک دن انہیں ایک بہت ہی قدیم تاریخی مندر بھی دکھایا گیا۔ اُس کے انچارج پنڈت جی کو ان کے لباس اور وضع قطع سے اندازہ نہ ہوا کہ وہ مسلمان ہیں لہذا وہ انہیں ہندو خاتون سمجھ کر بار بار مندر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتے کہ اس مندر کو ملیچھوں نے لوٹ کر برباد کر دیا تھا۔ بعد ازاں جب ان کے ساتھیوں میں سے کسی کے انہیں ''مس حیدر'' کہہ کر پکارنے سے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں تو پنڈت جی بہت شرمندہ ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے ملیچھ لفظ کا استعمال نہیں کیا اور بہت ہی محتاط انداز میں بات چیت کرتے رہے۔

۱۹۷۹ کے اواخر میں مَیں ''آج کل'' سے ٹرانسفر ہو کر پریس انفارمیشن چلا گیا، اور اُن سے ایک دو بار کسی ادبی جلسے میں بس آداب وسلام تک ہی سلسلہ رہا۔ بعد ازاں جب وہ جامعہ ملیہ سے نقل مکانی کر کے نوئیڈا کے ''جل وایو وہار'' میں منتقل ہو گئیں تو پھر میرا اُن کے ہاں آنا جانا کافی ہو گیا کیونکہ میرا قیام بھی جمنا پار کرشن نگر میں تھا اور مَیں اپنے کچھ رشتہ داروں سے ملنے اکثر نوئیڈا آتا جاتا رہتا تھا۔ دو چار

www.taemeernews.com

بارعید کے موقع پر بھی گیا اور انہوں نے خوب خاطر مدارات کی۔ ایک بار مَیں نے اُن کے ناول ''آگ کا دریا'' کا ہندی میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تو وہ کہنے لگیں کہ ترجمہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے، دوبارہ کس لئے؟ جب مَیں نے انہیں بتایا کہ پہلے ترجمے میں حذف واضافہ کیا گیا ہے۔ اور اس میں پانچ باب ہی غائب کر دئے گئے ہیں نیز اس میں کچھ نئے واقعات بھی جوڑ دئے گئے جو کہ اوریجنل ناول میں ہیں ہی نہیں۔ تب انہوں نے مجھے ترجمہ کرنے کی اجازت دے دی اور یہ ترجمہ ۲۰۰۰ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا جو کہ اندر پرستھ پرکاشن نے شائع کیا تھا۔ بعد ازاں میری گزارش پر ہی اس ادارے کے مالک اشوک شرما کو انہوں نے اپنی کئی کتابیں شائع کرنے کی اجازت دے دی جن میں سے ''گردشِ رنگِ چمن''، ''چائے کے باغ'' اور ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے ان کی یادداشت کچھ کمزور سی ہوگئی تھی اور وہ کئی باتیں بھول جاتی تھیں۔ ایک دفعہ مَیں اُن کے گھر نوئیڈا میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا تو ایک صاحب ایک تھیلا سا لٹکائے کمرے میں داخل ہوئے۔ عینی آپا نے پوچھا ہاں بھئی کیا بات ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ بی بی سی کا رپورٹر ہے اور اُن سے انٹرویو لینے کی غرض سے آیا ہے۔ اس پر وہ جھلا اُٹھیں ارے بھئی! تم لوگ تو بغیر بتائے ہی آجاتے ہو۔ مَیں اس وقت کوئی انٹرویو نہیں دے سکتی۔ پھر کبھی آنا'۔ اس پر اُس نوجوان نے کہا کہ میڈم! مَیں ٹیلی فون پر آپ سے وقت لے کر آیا ہوں۔ اس پر وہ کچھ خاموش سی ہوگئیں۔ تب مَیں نے جھجکتے ہوئے اُن سے کہا۔ عینی آپا! جب آپ نے اسے ٹائم دیا ہے تو انٹرویو دے دیجئے نا۔ اچھا نہیں لگتا۔ اس پر انہوں نے بہت روکھے پن سے اُس نوجوان کو صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اچھا اچھا بیٹھئے۔ اس کے چند منٹ بعد وہ اُٹھ کر اُس رپورٹر کے پاس صوفے پر جا بیٹھیں اور اُس کے سوالات کا جواب دینے لگیں۔ انہی سوالات کے دوران اُس

www.taemeernews.com

عینی آپا سے تقسیم ہند اور اُن کے پاکستان سے ہندوستان آجانے سے متعلق کوئی سوال پوچھ لیا۔ اس پر وہ کچھ جھنجھلا سی اُٹھیں اور سخت لہجے میں بولیں، ارے بھئی تمہارے پاس اور کوئی سوال نہیں پوچھنے کے لئے۔ میں اس سوال کا کتنی بار جواب دے چکی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ آپ ان سے انٹرویو لیجئے۔ یہ اُردو کے جانے مانے رائٹر ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں۔ یہ تقسیم کے بارے میں آپ کو اچھی جانکاری دیں گے۔ وہ رپورٹر اُن کے منہ کی جانب دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ میڈم! میں آپ کا انٹرویو لینے آیا ہوں۔ نہ کہ اس کا جسے میں جانتا ہی نہیں۔ میں بھی embarrassment محسوس کر رہا تھا لیکن وہ اپنا انٹرویو دینے کے بجائے بار بار میرا انٹرویو لینے پر زور دیتی رہیں۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور کوئی پندرہ بیس منٹ بٹوارے سے متعلق سوالات کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں وہ انٹرویو نشر ہوا یا نہیں کیونکہ وہ تو اُس نے عینی آپا کے مجبور کرنے پر طوعاً و کرہاً لیا تھا اور جس نے مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ آخر میرا انٹرویو کس لئے؟

وہ بہت ہی ملنسار اور خوش گفتار خاتون تھیں اور گھنٹوں دلچسپ باتیں کرتی رہتی تھیں مگر کبھی کبھار کسی بات پر اُن کا موڈ خراب ہو جاتا تھا تو خفگی کا اظہار بھی کرتی تھیں اور ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتی تھیں۔ ایک بار موڈ میں بیٹھی تھیں کہ عصمت چغتائی صاحبہ کا ذکر چھڑ گیا تو انہوں نے بتایا (اور شاید انہوں نے اپنے کسی مضمون میں لکھا بھی ہے) کہ عصمت کا کہنا تھا کہ انہیں قبر کی تنہائی سے بہت خوف لگتا ہے، مٹی میں تو پ دیتے ہیں اور اس سے تو ان کا قبر میں دم گھٹ کر رہ جائے گا۔ اس طرح ایک بار میری کسی تحریر پر انہوں نے ایک خط میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا لکھا تھا۔ کبھی خطوط کے ڈھیر میں ان کے دو تین محفوظ خط نکال کر دیکھوں گا کہ انہوں کیا لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں مجھے معذرت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور ایک آدھ سال تک میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر ایک دن اُنہیں ٹیلی

www.taemeernews.com

نہ ہوئی۔ اور ایک آدھ سال تک مَیں نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر ایک دن اُنہیں ٹیلی فون کیا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے اُس سے ایک دن پہلے عید تھی۔ وہ سمجھیں کہ عید کی مبارک کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں بولیں۔ کیا عید کی مبارک کہنے آرہے ہو۔ مَیں نے بھی فوراً کہا جی ہاں۔ بولیں تو آجایئے نا۔ اس کے بعد مَیں اُن کے ہاں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میری خوب خاطر تواضع کی۔

اُن سے آخری ملاقات اُن کی وفات سے کوئی دو سال قبل ہوئی تھی جب ماہنامہ ''چہارسو'' کے مدیر گلزار جاوید صاحب راولپنڈی سے تشریف لائے تھے۔ ایک تو انہیں عینی آپا سے ملنے کی بے حد خواہش تھی۔ دوسرے وہ اُن پر خصوصی گوشہ چھاپنے کے لئے ان کا انٹرویو بھی لینا چاہتے تھے۔ اُن سے ملنے سے پہلے ہی مَیں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ عینی آپا انٹرویو دینے کے لئے مشکل سے ہی تیار ہوں گی۔ اس لئے اس پر اصرار نہ کرنا ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔ نوئیڈا میں عینی آپا سے ملاقات سے پہلے ہم دونوں ملک زادہ جاوید صاحب کے گھر گئے جنہوں نے انہیں لنچ پر مدعو کر رکھا تھا اور پھر وہاں گلزار زتشی صاحب بھی تشریف لے آئے لہذا لنچ کے بعد ہم چاروں عینی آپا کے گھر گئے جہاں گلزار جاوید صاحب کا اُن سے تعارف کرایا گیا۔ اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ وہاں جو بھی بات ہوئی وہ سب گلزار جاوید صاحب نے عینی آپا کی نظر بچا کر نوٹ کر لی اور پھر انہوں نے بھی کئی سوال جو وہ سوچ کر آئے تھے باتوں باتوں میں پوچھ لئے۔ اور ایک دو بار بار تو انہیں نوٹس (Notes) لیتے دیکھ کر عینی آپا نے سوال بھی کیا کہ بھئی میرا انٹرویو تو نہیں لے رہے ہو؟ اس پر جب انہوں نے منفی میں سر ہلا دیا تو وہ پھر ہر پوچھے گئے سوال کا جواب دیتی رہیں۔ بعد ازاں گلزار جاوید نے 'چہارسو' جولائی اگست میں اُن پر خصوصی نمبر شائع کیا جس میں اُن کا انٹرویو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس میں جاوید صاحب نے بھی اُن سے پوچھا تھا کہ ''انسان ایک وقت میں ایک سمت میں دو مختلف عمل کا مرتکب ہو تو یقیناً ایک درست اور ایک غلط تصور

www.taemeernews.com

ہوگا۔آپ کا پاکستان جانا یا جا کر لوٹ آنا کس امر کا غماز ہے؟'' اس کے جواب میں انہوں کہا تھا کہ'' یہ میرا خالص ذاتی معاملہ ہے۔مَیں آپ سے دریافت نہیں کرتی کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیوں رہتے ہیں؟'' اس پر گلزار نے کہا کہ فنکار پبلک پراپرٹی ٹھہرتا ہے تو اُس کا کوئی عمل کیونکر ذاتی ہوسکتا ہے۔؟'' جواب میں عینی آپا نے بہت اچھا جواب دیا تھا کہ' بھئی جب مَیں پاکستان گئی ہوں ،اُس وقت ہم سب لوگ ہنگاموں میں پھنسے ہوئے تھے،اس لئے پاکستان جانا پڑا۔لیکن مَیں پاکستان سے پہلے انگلینڈ گئی، بعد میں انڈیا آ گئی۔ معاملہ سارا یہ ہے میں ایک خاتون ہوں۔ ہمارے معاشرے میں کوئی خاتون اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی۔مَیں نے اُٹھالیا تو قیامت برپا ہوگئی۔میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ اس حوالے سے میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔میرے خیال میں تو دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے ہندوستان میں آزادیٔ اظہار کے۔''

اور اس میں شک نہیں کہ عینی آپا کے نزدیک ہندوستان اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں تھا۔وہ پاکستان سے بھی اُتنا ہی پیار کرتی تھیں جتنا ہندوستان سے۔ وہ کسی مخصوص، ملک،قوم،فرقے یا علاقے کی پراپرٹی نہیں تھیں بلکہ ادبی لحاظ سے وہ ایک عالمی شخصیت تھیں۔اُن کے پرستار اور معتقد ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی تحریروں اور ادبی خدمات کی بدولت وہ ہمیشہ عالمی اُردو دنیا پر راج کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

کیلاش ماہر

پیدائش: ۸؍اکتوبر ۱۹۲۸ء مرادآباد شہر (اُتر پردیش)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ایک بھولا بسرا شاعر

کیلاش ماہرؔ

ہم نے بھی زہر پیا ہم بھی ہوئے ہیں مصلوب
کون پوجے گا مگر ہم کو رسولوں کی طرح

اس چونکا دینے والے اور قاری کے ذہن پر نقش ہو جانے والے شعر کے خالق کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن حصولِ آزادی کے بعد ملک میں اُردو کے اُفق پر اُبھرنے والے نوجوان شعرا میں یہ شاعر ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا جس نے بہت کم عرصے میں دنیائے شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا تھا اور جس کا شمار ملک کے معروف شعراء میں ہونے لگا تھا۔ مگر افسوس کہ آج اپنے تخلیقی سفر کے چھ دہے مکمل کر چکنے اور کئی یادگار نظموں اور غزلوں سے ہمارے شعری ادب میں خوشگوار اضافہ کرنے کے باوجود اس شاعر گوشہ نشین کی جانب نقادانِ فن نے کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی اُس کا مضامین میں کہیں تذکرہ و حوالہ ملتا ہے۔ جانتے ہیں یہ شاعر کون ہے؟ اُردو کا کہنہ مشق اور بزرگ شاعر کیلاش ماہرؔ جس نے گزشتہ چھ دہوں میں چمنِ اُردو کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے اور ہمیں لمس ہوا (غزلوں کا مجموعہ) اور ''لمحہ لمحہ

www.taemeernews.com

پیاس'' (نظموں کا مجموعہ) ایسے شعری مجموعے عطا کئے ہیں جن کی کئی نظموں اور غزلوں کے اشعار ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتے رہے ہیں۔

کیلاش ماہر نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا، اُس وقت ملک میں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی اور ملک کے ان گنت باشعور نوجوان ادیب اور شاعر اس تحریک سے متاثر ہوکر اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ماہر بھی اس سے اچھوتے نہ رہے اور وہ بھی اس عالمی ادبی تحریک سے متاثر ہوکر اس سے وابستہ ہوگئے اور ترقی پسند شعری روایات کو اپنی تخلیقات میں سمو کر وہ ادب اور سماج میں ایک انفرادی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے۔ اُن کا کلام اُن کے ترقی پسند خیالات واحساسات کا ترجمان تھا جیسا کہ مشہور نقاد پروفیسر قمر رئیس نے اُن کی نظموں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی شعری مجموعے ''لمس ہوا'' کے مقدمے میں لکھا ہے:

> ''آزادی کے بعد جن نوجوان شعراء نے ترقی پسند شعری روایت کے زندہ اور درخشاں عناصر سے فائدہ اُٹھایا اور انہیں اپنی آواز میں سمو کر تخلیقی فکر کے لئے اُفق تلاش کئے۔ اُن میں کیلاش ماہر بلاشبہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، امتیازی اس لئے کہ معاشیات اور دوسرے سماجی علوم کی آگہی نے ان کے شعور حیات پر جلا کی ہے اور اُن کی دردمندی کو انسان دوستی کا ایک ایسا آفاقی شعور بخشا ہے جو اُن کے معاصرین میں خال خال نظر آتا ہے۔''

ماہر نے ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اپنی نظموں میں تجربے کرنے کے علاوہ انہیں اپنے ذاتی ردِعمل کا آئینہ دار بھی بنایا ہے اور ساتھ ہی سماجی سیاسی اور تہذیبی موضوعات کا حقیقی مرقع بھی۔ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو اپنی نظموں میں اس

www.taemeernews.com

چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ نگاہوں کے سامنے ایک تصویر سی کھچ جاتی ہے ۔ ذاتی زندگی کی آئینہ دار نظموں میں ''تجزیہ''، ''رخصتی گڑیا کی''، ''نیوایرایو''، ''رم جھم''، ''لمحہ لمحہ پیاس'' اور ''لمس اول'' اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ آخرالذکر نظم کی یہ سطور ملاحظہ کیجئے:

یہ بھی کیا کم ہے تو نے مجھے پہچان لیا
وہ بھی کیا رات تھی جب تجھ سے ملاقات ہوئی
سہمی سہمی سی نگاہوں میں ذرا بات ہوئی
جب تری زلفِ پُرافشاں سے ہوا آتی تھی
دل کے تاریک بیابان مہک جاتے تھے
تو نے گھبرا کے چھپائی تھیں جو اپنی آنکھیں
جیسے دو ساغرِ رنگین کہیں چھلکے تھے.....
جب مرا ہاتھ ترے ہاتھ سے چھو جاتا تھا
تار جیسے کہیں بجلی کے سنک جاتے تھے
یہ بھی کیا کم ہے کہ تو نے مجھے پہچان لیا

اسی طرح انہوں نے اپنی نظم ''لمحہ لمحہ پیاس میں'' میں اپنی زندگی کے ذاتی جذبے کو ایک آفاقی جذبہ بنا کر قاری پر اس کے امٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
دھنک رنگ ماضی
میری زندگی کا ایک اِک لمحہ
کوئی مجھ سے چھینے لئے جا رہا ہے
جہاں زندگی شعلۂ بیکراں ہے

www.taemeernews.com

ہر اِک لمحہ اِک لمحۂ جاوداں ہے۔
قلم جیسے بوڑھا سپاہی تماشائے اہلِ ہنر دیکھتا ہو!
میری پیاس ابدی ہے شاید
مجھے ہر جنم میں.....
ندی پی کے پیاسا ہی جینا پڑتا ہے

ماہرؔ نے صرف ذاتی زندگی پر مبنی نظمیں ہی تخلیق نہیں کیں بلکہ انہوں نے مشترکہ تہذیب، سیکولرزم، امن و بھائی چارے وطن پرستی اور انسان دوستی پر مبنی بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ صدائیں آخر شب کی، مانا ستونتی، ''رقیب سرو ساماں نکلا''، ''دیپ جلے گلی گلی''۔ ''ابھی برف باری تھمی ہے''، ''یہ سفر ختم نہیں ہوا''، ''اہنسا''، نئی نسل کا آخری نوحہ'' کچھ ایسی ہی نظمیں ہے جو ہماری اقدار و احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ان ہی خیالات کا اظہار معروف محقق اور نقاد پروفیسر عنوان چشتی نے اُن کے نظموں کے مجموعے ''لمحہ لمحہ پیاس'' پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''لمحہ لمحہ پیاس'' میں شاعر اپنی پیاس کی شدت کو اتنا محسوس کرتا ہے کہ اس کو ندی پی کر بھی پیاسا رہ جانے کا احتمال ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاعر کی زندگی ''شعلۂ بیکراں'' ہے۔ یہی شعلۂ تشنگی شاعر کے تخلیقی تجربے کی اساس ہے۔ اور نقطۂ ارتکاز بھی ''نیو ایر ایو'' میں تھکن کے احساس میں گزرتے وقت کی چاپ بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے شاعر جذباتی طور پر آرام طلبی کی جانب راغب ہے مگر وقت کی مٹھی سے کھسکتی ہوئی ریت کو بھی محسوس کرتا ہے اور اُس

www.taemeernews.com

کے بعد اورزیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔شاعر نے وجود کی
وساطت سے جو تجربہ کیا تھا۔وہ اُس کے سوچتے ہوئے ذہن
کی زد پر آ کر ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔اس لئے کیلاش
ماہر کی نظموں کا خالص جمالیاتی پس منظر اُس کی سوچ کو ممیّز
کرتا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جو کیلاش ماہر کو آزاد ذہن کا
شاعر بنا دیتی ہے۔''

نظموں کے علاوہ ماہر کی غزلیں روایتی حسن و دلکشی اور سادگی و شگفتگی کی آئینہ دار ہیں جن میں انسانی درد و کرب، احساسات و جذبات کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔اُن کے کلام میں متعدد ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جو ہماری ذاتی سیاسی اور سماجی زندگی کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں' مثلاً

وقت کی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی کہ اب
رات پیلی ہوگئی ہر صبح کالی ہوگئی

چھیڑی تھی شام زلف، شکن در شکن کی بات
منسوب ہم سے ہوگئی دار و رسن کی بات

پہرے ہزار حرف و نوا پر لگایئے
لیکن لبوں پہ آ کے رہے گی چمن کی بات

ہم بھی تابندہ تھے گلشن میں ببولوں کی طرح
ہم کو توڑا گیا سرکاری اصولوں کی طرح

www.taemeernews.com

اُردو غزل میں ہجر و وصال اور عشق و جنوں اور تنہائی و بے وفائی کی باتیں لگ بھگ سبھی شعراء نے اپنے اپنے انداز میں کہی ہیں۔ ماہر کے بھی بہت سے شعران ہی موضوعات کی عکاسی کرتے ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتے ہیں اور دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں جیسے:

اتنے مانوس ہیں اب شام کی تنہائی سے
غم کے ماروں کو ترا قرب گوارا بھی نہیں

رنگ زمانہ دیکھ کے ترکِ وفا سہی
دل سے ترا خیال گیا ہو تو بات ہے

اتنی بھی رفاقت غمِ تنہائی سے کب تھی
اکثر تری قربت میں بھی رنجیدہ رہے ہیں

شبِ ہجر کیا ڈھلے گی وہی حالِ دل ہے ماہرؔ
ہمیں جاگنا بھی مشکل ہمیں نیند بھی نہ آئے

آہٹیں پا کے بہاروں کی پہن لی زنجیر
تیرے دیوانوں میں یہ بات کہاں تھی پہلے

ماہرؔ ایک اچھے منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کے شعروں میں کلاسکیت اور جدیدیت کا عمدہ سنگم ہے۔ ان کے متعدد اشعار قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور بعض دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مگر اہلِ ادب نے اُن کی جانب کوئی خاص توجہ

www.taemeernews.com

نہیں دی۔ غالباً اُن کے مقبول نہ ہونے کی وجہ اُن کی خود داری اور انا ہے جس کے کارن وہ نظر انداز ہوکر رہ گئے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ صرف شاعری ہی کرتے رہے دوسرے کئی شعراء کی طرح انہوں نے رابطہ عامہ کی جانب توجہ نہیں دی اس لئے ادب میں اُن کی وہ پذیرائی نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر وہ بھی دوسرے اکثر ادیبوں کی طرح اس جانب بھی توجہ دیتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ کیونکہ آج اپنی تخلیقات اور تصنیفات کی تشہیر کے لئے پبلک ریلیشنگ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن وہ شاعری کے ماہر ہوتے ہوئے بھی اس فن کے ماہر نہیں بن سکے۔ اور آج وہ عمر کے اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ گوشہ تنہائی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

لیکن کیا کیا جائے ہر دور میں کچھ نام نہاد نقاد، ادب کے ٹھیکیدار شاعر اور ادیب کے ادبی گروہ، اُس کی لابی، مرتبہ اور حیثیت کو دیکھ کر انعامات و اعزازات کی بوچھار کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے جینوئین شاعر اور ادیب انعام و اعزاز سے محروم رہ جاتے ہیں اور بعض اپنے رتبے، حیثیت اور زبردست لابی کی بنا پر ان سے سرفراز ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں سوائے ادباء و شعراء کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ان ادبی ٹھیکیداروں کی بد دیانتی اور ذہنی دیوالیے پن پر اظہار افسوس کرنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

شاید عمر کی آخری منزل پر پہنچ کر ماہر کو بھی ادب میں ہونے والی اس بد دیانتی، دوست نوازی اور افسر نوازی کا احساس ہوگیا ہے اسی لئے وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے مگر اُن کے کلام میں اس طرح کے احساسات و جذبات کا کئی جگہوں پر اظہار کیا گیا۔ آج زندگی کے آخری پڑاؤ پر پہنچ کر انہوں نے سب کچھ تیاگ کر مایوسی اور نا اُمیدی کے عالم میں گوشہ تنہائی اختیار کرلیا ہے۔ اور مجھے ایسے موقع پر اُن کی نظم ''تجزیہ'' یاد آتی ہے جس میں خود احتسابی کرتے ہوئے شاید انہوں نے کہا ہے کہ:۔

www.taemeernews.com

اپنے ماضی کا آئینہ لے کر
جانے کب سے اُداس بیٹھا ہوں.....

ان دنوں کوئی مدّعا بھی نہیں
ان دنوں میں نے کچھ لکھا ہی نہیں
ان دنوں ذہن سوچتا بھی نہیں
ان دنوں دل میں اک خیال سا ہے
اپنے ہونے کا کچھ ''ملال'' سا ہے

☆☆☆

www.taemeernews.com

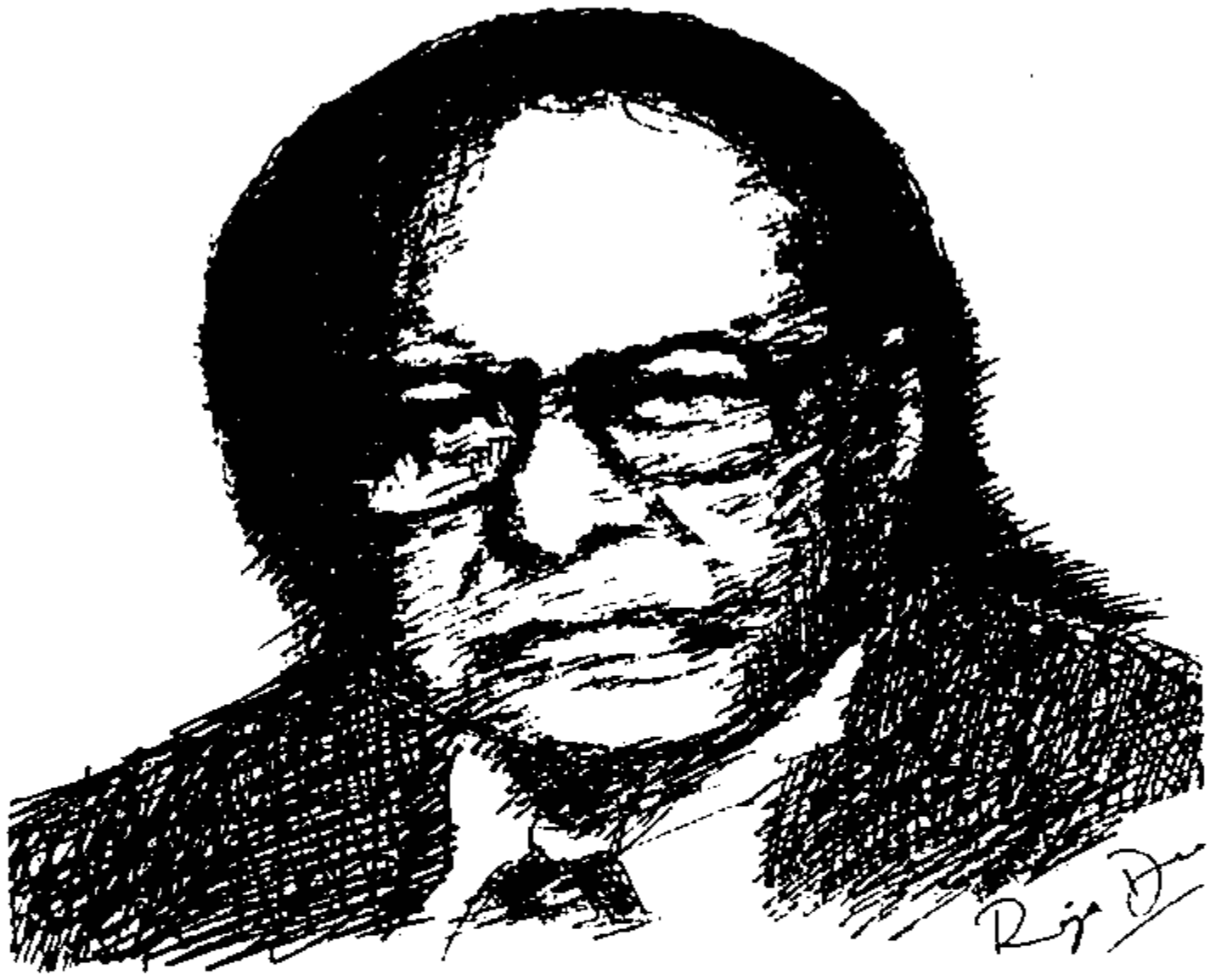

گوپی چند نارنگ

پیدائش: ۱۱ر فروری ۱۹۳۱ء دُکی (بلوچستان، پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اُردو کی بین اقوامی شخصیت

پروفیسر گوپی چند نارنگ

گوپی چند نارنگ ہمارے دور کی وہ ممتاز و نامور شخصیت ہیں جن کی اُردو زبان وادب کے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں نے بے پناہ تعریف وتوصیف کی ہے اور جنہیں علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی میدان میں ایک بلند قامت شخصیت قرار دیا ہے۔ اُن کے متعلق اتنا کچھ کہا اور تحریر میں لایا جا چکا ہے کہ میرا کچھ کہنا یا تحریر میں لانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تاہم نارنگ صاحب کی شخصیت اور علم وادب میں اُن کے مرتبہ ومقام سے متعلق کچھ تاثرات اور یادیں ہیں جنہیں قلمبند کرنے کو جی چاہا اور قلم اُٹھا کر اپنے نصف صدی سے زائد تعلقات کے احساسات وتاثرات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا کہ شاید مستقبل کا محقق اور قاری اس سے مستفید ہو سکے۔

نارنگ صاحب کو میں لگ بھگ نصف صدی سے جانتا ہوں اور وہ بھی مجھے تقریباً چالیس سال سے جانتے ہیں۔ یہ جاننے کے سلسلے میں ایک عشرے کا فرق کیوں؟ وہ یوں کہ پہلی بار میں نے انہیں ملازمت کے سلسلے میں ہو رہے ایک انٹرویو میں دیکھا تھا مگر وہاں مَیں صرف اُن کے نام سے ہی آشنا ہو سکا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۵۴۔۵۵ء کا واقعہ ہے۔ جب وزارت اطلاعات ونشریات کے شعبہ ڈائرکٹوریٹ

www.taemeernews.com

آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی (ڈی اے وی پی) میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی پوسٹ کے لئے کوئی ایک درجن امیدواروں کو بلایا گیا تھا جس میں صحافت و ادب سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوان ادیب اور شاعر انٹرویو دینے آئے تھے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ جب میں انٹرویو کے لئے وہاں پہنچا تو وہاں آٹھ دس امیدوار انٹرویو دینے آئے ہوئے تھے جن میں گوپی چند نارنگ صاحب، راج نرائن راز صاحب، لکھنؤ کے مشہور شاعر منظر سلیم، مستانہ جوگی کے موجودہ ایڈیٹر جے۔ پی۔ بھٹناگر اور شیر پنجاب کے ایڈیٹر امر سنگھ کے صاحبزادے (نام یاد نہیں) وغیرہ شامل تھے۔ اُن دنوں راز صاحب اور نارنگ صاحب میں بہت گہری دوستی تھی اور وہ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر گھومتے تھے۔ یہ دوستی کئی سال تک قائم رہی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دُور ہو گئے۔ انٹرویو کے دوران باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نارنگ صاحب ہیں جو پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور دوسرے راج نارائن صاحب ہیں جو دہلی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کر رہے ہیں۔

راز صاحب اور نارنگ صاحب میں دوستی کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو دونوں بلوچستان سے آکر دہلی آباد ہوئے تھے۔ دوسرے دونوں ایک ہی ضلع لورالائی میں پیدا ہوئے تھے۔ (راز صاحب کی جائے ولادت تھی لورالائی اور نارنگ صاحب کی ضلع لورالائی کی تحصیل دُکی) اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ ایک ہی ضلع میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان دونوں کا سالِ ولادت بھی ایک ہی تھا یعنی ۱۹۳۰ء۔ اس پوسٹ کے لئے انٹرویو لینے والوں میں خوشونت سنگھ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈائرکٹر نیّر شامل تھے۔ انٹرویو سے پہلے ہی لگ بھگ پتہ چل گیا کہ اس پوسٹ کے لئے نارنگ صاحب کا انتخاب ہونا ہے جو کہ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اس موقع پر صرف مَیں اُن کا نام

www.taemeernews.com

ہی جان پایا۔ واقفیت اور تعارف کی نوبت نہیں آئی۔

کچھ مدت بعد ۱۹۵۶ء میں مَیں نے پنجاب یونیورسٹی کے کیمپ کالج سے فارسی میں ایم اے کرنے کی غرض سے شام کی کلاسیں جوائن کرلیں جہاں مجھے ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایسے اُستاد سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا جو بہت ہی عالم فاضل شخصیت تھے اور شاعری میں بھی اچھی شہرت و دسترس رکھتے تھے۔ اسی دوران میں دہلی سرکار کے دفتر میں میں ملازم ہوگیا اور کوئی پانچ سال تک اس کے محکمہ تعلقاتِ عامہ میں بطور Examiner-cum -Translator خدمت انجام دیتا رہا۔ پھر ۱۹۶۴ء میں مَیں پبلی کیشن ڈویژن کے ماہنامہ آج کل میں بطور سب ایڈیٹر ملازم ہوگیا۔ اور چونکہ اُن دنوں میں دہلی یونیورسٹی کے قریب واقع کالونی تیمار پور میں رہتا تھا اس لئے مَیں نے دہلی یونیورسٹی کی شام کی کلاسیں جوائن کرلیں۔ اور یہیں صحیح معنوں میں مجھے نارنگ صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

جب میں نے ایم اے اُردو میں داخلہ لیا تھا تو اُس وقت نارنگ صاحب وسکانسن میں وزیٹنگ پروفیسر تھے اور کوئی ایک برس بعد ۱۹۶۵ میں انہوں نے شعبۂ اُردو جوائن کیا تھا۔ تاہم کلاس میں اکثر اُن کا ذکر خیر ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہاں لوگ بتاتے تھے کہ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں اردو میں ایم اے کرنے کی غرض سے داخلہ لیا تھا اور وہ اپنے اُستاد خواجہ احمد فاروقی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے اور یہ کہ وہ اُن کا ہر حکم بجالاتے تھے اور اُن کی خدمت اور اپنی محنت و لیاقت کی بدولت ہی وہ قلیل مدت میں علم و ادب کے اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں لوگوں کو پہنچنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

وسکانسن سے واپسی پر جب نارنگ نے شعبۂ اُردو جوائن کیا تو صحیح معنوں میں انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا جہاں وہ میرے اُستاد تھے اور میں اُن کا شاگرد۔ حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے ایک سال چھوٹے تھے لیکن ''بزرگی از علم است نہ

www.taemeernews.com

کہ از عمر''۔

نارنگ صاحب بہت جلد طلباء میں بے حد مقبول ہو گئے کیونکہ بطور استاد اُن کے پڑھانے کا طریقہ دوسرے اساتذہ سے الگ تھلگ تھا۔ عام طور پر اُستاد شاگردوں سے کچھ فاصلہ رکھتے ہیں اور اپنے طلباء کے زیادہ قریب ہونے سے گریز کرتے ہیں مگر نارنگ صاحب نے آتے ہی طلباء کو اس بات کا احساس کرادیا کہ اُستاد بھی اُن ہی کی طرح ہے اور دونوں کو آپس میں فاصلہ نہیں رکھنا چاہیے اور ایک دوسرے میں اپنائیت کا احساس پیدا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں نارنگ صاحب نے آتے ہی ایم اے اُردو کے تمام طلباء سے الگ الگ مل کر اُن سے متعلق جانکاری حاصل کی اور ہر ایک سے قربت اور بے تکلفی پیدا کرنے کی غرض سے ساری کلاس کو اپنے گھر میں ایک خاص دعوت میں مدعو کیا جہاں انہوں نے اور اُن کی اہلیہ نے طلباء کو خود مشروب اور بسکٹ وغیرہ پیش کئے اور ہر ایک کو اصرار کر کے کھلایا پلایا۔ یہ ایک ایسی شاندار اور بے تکلف دعوت تھی کہ سب نارنگ صاحب کی مہمان نوازی اور ان کے اپنے پن کے کارن اُن کے گرویدہ ہو گئے اور انہیں اپنا اُستاد ہی نہیں بلکہ اپنا ہمدرد، دوست اور ساتھی بھی سمجھنے لگے۔

اُن کی کلاس سے بھی طلباء بہت کم غیر حاضر ہوتے تھے کیونکہ وہ اس انداز سے لیکچر دیتے تھے کہ طلباء کو لیکچر بہت جلد ذہن نشین ہو جاتا تھا اور وہ اُن کی کلاس میں بور (Bore) بھی نہیں ہوتے تھے۔

ایم اے کرنے کے بعد بھی اُن کے بہت سے طلباء سے ذاتی تعلقات قائم رہے۔ ہمارے ایک ہم جماعت بلدیو شانت نے تو بچوں پر لکھے اپنے ناول میں تو اُن کا اور پروفیسر قمر رئیس صاحب، پروفیسر محمد حسن صاحب اور پروفیسر شریف احمد پر کئی صفحات میں اُن کے کردار اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی تھی۔ اور ہمارے ہم جماعت ڈاکٹر رام آسرا راز کو جو بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر مامور رہے، ڈاکٹریٹ کرنے میں بھی نارنگ صاحب کا مشورہ و

www.taemeernews.com

رہنمائی حاصل رہی ہے اوران ہی کے کہنے پر رام آسرا نے بنارس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ نارنگ صاحب نے مجھے بھی سعادت حسن منٹو پر پنجاب یونیوسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دینے کے علاوہ اس کے لئے Synopsis تیار کرنے میں میری مدد کی تھی مگر بعد ازاں یونیوسٹی میں رجسٹریشن کے لئے درخواست دینے کے باوجود بھی بوجوہ مَیں نے ارادہ ترک کر دیا۔

کالج سے فارغ ہونے کے باوجود بھی نارنگ صاحب سے رابطہ قائم رہا خصوصا! جب وہ ہندوستان سے باہر ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ''آج کل'' میں مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی دوسرے وہ ایک ہاؤسنگ کواپریٹو سوسائٹی کے ممبر تھے جس کے ممبر ہمارے پبلی کیشن ڈویژن کے لائبریرین سوم ناتھ سادھو بھی تھے۔ اور وہ میرے توسط سے سادھو سے جانکاری حاصل کرتے رہتے تھے کہ سوسائٹی ہذا کو کہاں زمین الاٹ ہوئی ہے اور کب تک پلاٹ حاصل ہو جائیں گے۔

نارنگ صاحب سے یہ رشتہ زائد از چالیس سال سے قائم ہے مگر اس کے باوجود ہمارے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ رہا ہے اور میرا اُن کے گھر آنا جانا نہ کے برابر رہا ہے۔ مَیں غالبًا ان کی قیام گاہ پر صرف ایک یا دو بار گیا ہوں اور وہ بھی تب جب کبھی نارنگ صاحب نے کسی کام سے بلایا ہو۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مَیں آخری بار ۷۳۔۱۹۷۲ میں سرودے انکلیو میں واقع اُن کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے درمیان تعلقات ہمیشہ استوار رہے ہیں۔ جب اُن کے صاحبزادے ترون کی شادی ہوئی تھی تو اس کے ریسپشن کی دعوت میں بھی انہوں نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس کے علاوہ اگر میں بھول نہ جاؤں تو لگ بھگ اُن کی ہر سالگرہ پر مبارک باد دینے کے لئے انہیں ضرور ٹیلی فون کرتا رہا ہوں۔ باقی ضرورت پڑنے پر کبھی کبھار ٹیلی فون پر بات چیت ہو جاتی ہے اور سرسری ملاقاتیں عام طور پر ادبی تقاریب تک محدود ہیں۔

www.taemeernews.com

نارنگ صاحب نے تقریر وتحریر دونوں میں ہی اپنا ایسا سکہ جمایا ہے کہ آج لوگ اُن پر رشک کرتے ہیں۔ وہ بلوچستان ایسے علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی عمدہ، شستہ اور شگفتہ لہجے میں تقریر کرتے ہیں کہ اہل زبان بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اُن کی تقریر میں وہ کشش ودل کشی ہے کہ وہ سامعین کو اپنی سحر انگیزی سے اپنا گرویدہ و پرستار بنا لیتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے مشہور ومعروف احراری خطیب ورہنما عطااللہ شاہ بخاری کو بہت بڑا جادو بیاں مقرر کہا جاتا تھا جن کی گھنٹوں تک تقریر جاری رہتی تھی اور لوگ ہمہ تن گوش ہوکر سنتے تھے۔ لہذا اگر آج نارنگ صاحب کی دلکش اور سحر انگیز تقریر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں ادب کی دنیا کا عطااللہ شاہ بخاری کہا جائے تو کوئی غلط نہ ہوگا۔

نارنگ صاحب آج ادب کے ہر صنف سخن میں اپنا کمال دکھا چکے ہیں ۔ تحقیق ہو یا تنقید، شاعری ہو یا لسانیات، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت ہر میدان میں انہوں نے اپنا پرچم گاڑ رکھا ہے، اُن کی سوچ وفکر کے نئے نئے گوشوں، وسیع مطالعے، تحقیقی موشگافیوں، تنقید کے جدید ترین پہلوؤں اور لامحدود ذہنی رسائیوں اور منفرد علمی سوچ نے انہیں برصغیر میں ہی نہیں بلکہ تمام اُردو دنیا کے لئے باعث کشش بنا دیا ہے۔ اسی لئے صرف ہندو پاک میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کی یونیورسٹیاں بھی انہیں مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر لیکچرز دینے کے لئے مدعو کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہیں۔ وہ امریکہ کینیڈا، برطانیہ، چیکوسلواکیہ، سوویت روس، وغیرہ کی کئی دانشگاہوں اور علمی اداروں میں اُردو زبان وادب سے متعلق مختلف موضوعات پر اپنے بیش قیمت مقالات پیش کر چکے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس دور میں اُردو ادب میں یک ایسا مقام رکھتے ہیں جہاں پہنچنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ آج وہ اُردو کی واحد شخصیت ہیں جنہیں دنیا بھر میں لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں اور اسی لئے ہم اہلِ اُردو انہیں اُردو کی بین اقوامی شخصیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

اسرار الحق مجاز

پیدائش:۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء، ردولی (اُتر پردیش)

وفات:۵/دسمبر ۱۹۵۵ء لکھنؤ (اُتر پردیش)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

مجاز کی موت یا خودکشی؟

یوں تو اگر ہم تاریخ اُردو ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں کئی ایسے برگزیدہ و نامور شاعر مل جائیں گے جنہوں نے کثرتِ مے نوشی کی علت میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر دیا مگر اُن میں سے ہمارے دَور کے دو شاعر اسرار الحق مجاز اور نریش کمار شاد کو ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے شراب کے نشے میں چور، بدمست، لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے ہوئے کسی سڑک یا گلی میں بڑی ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا ہے جنہوں نے ضرورت سے زیادہ شراب پی پی کر آخر اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔ ان کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ اس قدر بے تحاشہ اور اندھا دھند شراب نہ پیتے تو شاید وہ طویل عمر تک زندہ رہتے اور اُردو ادب کو اپنی کئی مزید شاہکار تخلیقات سے سرفراز کرتے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں مجاز ایک ذہین اور باشعور شاعر تھے اور دنیائے ادب میں جلد ہی انہوں نے اپنی منفرد شاعری سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور آسمان شعر و ادب پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکنے لگے تھے۔ ان کے شعری مجموعے ''آہنگ'' کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی مگر دنیاوی معاملے میں انہیں محرومیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا جس کے کارن انہوں نے بے دریغ شراب پی پی کر

www.taemeernews.com

اپنے آپ کو قبل از وقت موت سے دوچار کرلیا اور صرف ۴۶ سال کی عمر میں ۵/دسمبر ۱۹۵۵ کو لکھنؤ کے بلرام پور ہسپتال میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں انتقال کر گئے اور دوسرے دن ہزاروں سوگوار دوستوں عزیزوں، مداحوں اور پرستاروں کی موجودگی میں انہیں نشاط گنج کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بلاشبہ ان کی قبل از وقت موت سے اُردو ادب ایک نامور شاعر سے محروم ہوگیا جس سے اُردو ادب کی کئی توقعات وابستہ تھیں۔ ورنہ ابھی اُن کے مرنے کے دن نہ تھے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس شاعر کی شاعری پر سینکڑوں لڑکیاں دل و جان سے فریفتہ تھیں اور اُس کی شعری تخلیق ''آہنگ'' کو خود ہی نہیں پڑھتی تھیں بلکہ عید بقرعید پر سہیلیوں کو بطور تحفے بھی دیا کرتی تھیں مگر افسوس ان میں سے ایک بھی ان کی رفیق حیات یا محبوبہ نہ بن سکی اور وہ دل میں ہزاروں ارمان لئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مگر اس کے لئے کون ذمہ دار ہے معاشرہ، لڑکیاں یا خود مجاز؟

ہسپتال بھرتی ہونے سے ایک دن پیشتر شام کو مجاز اپنی باغ و بہار طبیعت کے مطابق اپنے دوستوں سے بذلہ سنجی میں مصروف رہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ رات کے بارہ بجے کے قریب وہ اپنے چند ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے پر شراب لینے کی غرض سے پہنچے اور پھر کوئی دو تین گھنٹے اپنے ہم مشربوں کے ساتھ گلاس بھر بھر کر پینے میں منہمک رہے۔ اور جب وہ لگ بھگ بے ہوش ہو چکے تھے تو اُن کے ساتھی تین بجے کے قریب انہیں وہیں دکان کے آنگن میں چھوڑ کر گھر چلے گئے جہاں انتہائی سرد رات میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ نمونیہ اور فالج کا شکار ہو گئے۔ دکان کے مالک نے ایک قریبی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو اس نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا۔ پھر دوپہر کے قریب وہ اسے بلرام پور ہسپتال پہنچا گیا۔

ہسپتال کے ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ کے مدنظر انہیں پینسلین کے انجیکشن لگانے شروع کر دئے اور جب شام کو ہسپتال کے ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا تو اس نے تشخیص کیا کہ ان کے جسم کے داہنے حصے میں فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ اور دماغ کی رگ

www.taemeernews.com

پھٹ گئی ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان تین دنوں میں اُن کے گھر والوں نے ان کی کوئی خیر خبر نہیں لی کیونکہ نشے کی حالت میں گھر سے کئی کئی دن تک غائب رہنا ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ ان کے لئے معمول سا تھا۔ اس طرح کے میخواروں کے والدین اور عزیز ان کے گھر سے غائب ہونے یا کسی گلی کوچے میں بے ہوش ہو جانے کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے جواں مرگ شاعر نریش کمار شاد جو اکثر دہلی کے کسی کوچہ و بازار میں بدمستی یا بے ہوشی کے عالم میں پائے جاتے تھے۔ جن دنوں میں اولڈ سیکرٹیریٹ میں پبلی کیشن ڈویژن کے ماہنامہ ''آج کل'' سے بطور مدیر معاون وابستہ تھا تو ایک دن جب ہم لوگ لنچ میں سیر کر کے واپس اپنے کمرے میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شاد نشے کے عالم میں عرش ملسیانی صاحب کی کرسی پر براجمان اول فول بک رہے ہیں اور سامنے بوتل رکھی ہوئی ہے۔ خیر ہم نے بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے ہٹایا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ایک بار وہ بالکل ہمارے کمرے کے سامنے ہی میدان میں بے ہوش پائے گئے۔ تب عرش ملسیانی ایڈیٹر ''آج کل'' نے مجھے کہا کہ اسے تیمار پور چھوڑ آؤ۔ شاد اس وقت ایسی حالت میں تھے جیسے بے جان لاش ہوں۔ دو تین آدمیوں نے مل کر اُنہیں بڑی مشکل سے آٹو پر لادا اور میں انہیں چھوڑنے تیمار پور ان کے گھر لے گیا۔ کوارٹروں میں مَیں نے ان کے گھر کا پتہ پوچھا اور آٹو کو وہاں لے گیا۔ کوارٹر کے باہر شاد کی بیوی چارپائی پر بیٹھی کسی عورت سے محوِ گفتگو تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ شاد صاحب آٹو میں بے ہوش پڑے ہیں مگر وہ اس جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے کہنے لگی۔ ''لے آؤ''۔ میں نے اور آٹو والے نے بڑی دقت و دشواری سے شاد کو آٹو سے باہر نکالا اور اندر کمرے میں لٹا دیا۔ مگر اس کی بیوی کے دل میں اس کے لئے کوئی ہمدردی نہیں تھی، وہ پاس کھڑی محوِ تماشا رہی۔ اور جب میں نے اُسے آٹو کو تین چار روپے کرایہ دینے کے لئے کہا تو اس نے بڑی بے دلی سے پیسے دئے جیسے کہہ رہی ہو جب یہاں تک لائے ہو تو کرایہ بھی تم ہی دے دو۔

www.taemeernews.com

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے عادی میکساروں کے گھر والوں کے لئے ان کا گلی محلوں میں بدمست حالت میں گھومنا، بہکنا، لڑکھڑانا، بے ہوش ہو کر گر پڑنا عام سی بات بن کر رہ جاتی ہے۔ بہر حال کسی جان کار نے مجاز کو ہسپتال میں دیکھ کر ان کے گھر والوں کو اطلاع دی مگر جب تک گھر والے پہنچے ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوسی کا اعلان کر چکے تھے اور آکسیجن کے ذریعے ان کی سانس کی آمد و شد کو قائم رکھنے کی آخری کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

لیکن سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور مجاز کسمپرسی کی حالت میں اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھ کر رخصت ہو گئے۔ حالانکہ ان کی عمر ابھی رخصت ہونے کی نہیں تھی مگر ان کے ہم مشربوں اور ہم پیالہ و نوالہ ساتھیوں نے مل کر ان کی زندگی کو موت کے منہ میں دھکیلنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ لوگ سچ کہتے ہیں سنگت انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مجاز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے شراب پلا پلا کر آخر اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ بے وقت موت سے دوچار ہو گئے۔ اور آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ وقت سے پہلے ہی غروب ہو گیا۔

لہذا اگر یہ کہا جائے کہ مجاز فطری موت نہیں مرے تھے بلکہ کثرت شراب نوشی، لاابالی پن، غیر منضبط زندگی نے انہیں وقت سے پہلے ہی موت کی آغوش میں دھکیل دیا تھا، تو غلط نہ ہوگا۔ حقائق کے مطالعہ سے بھی ہم پر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مجاز مرے نہیں تھے بلکہ انہوں نے خودکشی کی تھی اور اس کے ذمہ دار کون تھا مجاز، سماج، حالات یا ان کے سنگی ساتھی؟

میرا خیال ہے کہ اس کے لئے ان کی زندگی کے واقعات و حوادث پر ایک نظر ڈالیں تو یہ بات ہم پر پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

مجاز جنہیں اردو شاعری کا جان کیٹس کہا جاتا ہے، ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود تبلیغ اور پروپیگنڈے سے دور دور رہے۔ دوسرے کئی ترقی پسندوں کی طرح ان کی شاعری کا محور بھی حسن و عشق رہا۔ تاہم ان کی ابتدائی نظموں میں بھی سرکشی اور بغاوت کی بجلی کوندرہی تھی۔ انہوں نے عورت کو بھی انقلاب اور بغاوت کی

www.taemeernews.com

راہ دکھائی۔

مجازؔ تعلیم کی تکمیل کے بعد زندگی کی جدو جہد میں جُٹ گئے۔ شاعری نے انہیں بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا مگر دنیاوی معاملات میں وہ بھٹک گئے۔ لا اُبالی پن، بے راہ روی کثرت شراب نوشی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔

جہاں ملازمت کی وہاں ٹک نہ سکے۔ انہوں نے ملازمت ترک کی یا انہیں نکالا گیا؟ جو بھی ہو۔ اس کا اُن کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔

۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے دہلی آکر وہ دو سال آل انڈیا ریڈیو کے ماہنامہ ''آہنگ'' سے وابستہ رہے۔ مگر پھر انہیں اس سے الگ کر دیا گیا۔ شاید اُن کا لا اُبالی پن، غیر انضباطی رویہ اور شراب نوشی اس کی وجہ ہو، تاہم ان کے بعض محققین کا کہنا ہے کہ وہ بخاری برادران کے صوبائی تعصب اور تاناشاہی کے کارن وہاں نہیں ٹک سکے؟ مگر یہ کوئی نیا الزام نہ تھا یہ الزام تو اکثر غیر پنجابی ادباء و شعراء بخاری برادران خصوصاً پطرس بخاری پر لگاتے رہے ہیں کیونکہ اُن کے عہد میں پنجاب کے جتنے بھی نامور اور ممتاز شعراء و ادباء تھے، سارے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ تھے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی..... اُن دنوں سبھی کی آماجگاہ یہی آل انڈیا ریڈیو دہلی ہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ معروف ادیب اور ماہنامہ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے بھی اس سلسلے میں ریڈیو کے سربراہ کو شکایت کی تھی اور پطرس بخاری سے جواب بھی مانگا گیا تھا مگر جب بخاری صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے دوست نوازی کی بنا پر پنجاب کے سارے دوست ادیبوں کو یہاں کیوں اکٹھا کر لیا ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ مَیں یہاں اپنے دوست نہیں تو کیا اپنے دشمنوں کو یکجا کرتا کہ نہ تو وہ خود کام کرتے اور نہ مجھے کرنے دیتے۔

اس ملازمت کے جانے کا مجازؔ کو بے حد صدمہ ہوا۔ مایوسی اور ناکامی کی حالت میں وہ دہلی سے مجبوراً لکھنؤ چلے گئے مگر اس واقعے سے ان کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا اور اس غیر معمولی ذہنی اذیت کا اظہار انہوں نے اپنی طویل نظم ''دلی سے واپسی'' میں یوں کیا ہے:

www.taemeernews.com

رخصت اے دلی! تری محفل سے اب جاتا ہوں مَیں
نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بہ لب جاتا ہوں
یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں ، میری جولاں گاہ تیرے بوستاں
کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں
کتنے رنگیں عہدو پیماں توڑ کر آیا تھا مَیں
دلِ نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا مَیں

دل شکستہ مجاز دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔ گھر کے حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ والد ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں گھر میں بیکار بیٹا کیسا لگتا ہوگا۔ ہم بھی جانتے ہیں؟ شاید انہوں نے اپنے آپ کو نئے حالات میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر بے سود۔

پھر وہ لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایم اے کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے، مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اور انہوں نے اپنی پڑھائی منقطع کر دی۔ اسی دور میں ترقی پسند رسالہ ''نیا ادب'' منظر عام پر آیا جس کے مدیران سردار جعفری اور سبطِ حسن کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔

۱۹۴۱ء میں ان کی دماغی حالت ٹھیک نہ رہی لیکن روبہ صحت ہونے پر وہ دہلی آ کر پبلی کیشن ڈویژن میں بطور لائبریرین کام کرنے لگے مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ ٹک سکا۔ اور ۱۹۴۴ء میں یہ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔

نوکری نہ رہنے کا ایک اور جھٹکا۔ مایوسی اور ناکامی نے انہیں اندر سے شاید توڑ دیا۔ اور پھر عشق کے میدان میں بھی انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ محبوبہ چند جلوے دکھا کر اوجھل ہو گئی۔ وہ محبوبہ جس کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا:

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں! کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں، وہ اُس دنیا کی عورت ہے

www.taemeernews.com

سراپا رنگ و بو ہے، پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں، گہر افشانیاں اس کی
وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہِ طلعت ہے
میرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

اُس کی تابانیوں نے اس کی آنکھوں کو خیرہ ضرور کیا مگر اس کے بعد وہ ان سے دور ہوگئی کیونکہ وہ ایک ایسی امیر زادی کے دامِ عشق میں گرفتار ہوئے تھے جس کا ملنا کارِ دشوار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شعلہ رو نے مجاز کو حوصلہ تو دیا لیکن اس کی جلن پر مرہم رکھنے کو راضی نہ ہوئی۔ دراصل وہ خاتون ایک امیر تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھی۔ اگرچہ وہ پردے کی پابند نہیں تھی مگر وہ مجاز کے عشق کی پینگ کو اتنا زیادہ بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتی تھی کہ بالآخر رفیقِ حیات بننے کی نوبت آجائے۔ وہ کچھ مدت آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتی رہی پھر اچانک اس سے دور ہوگئی..... اور مجاز عشق کے اس کاری صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔

ان ناکامیوں اور مایوسیوں کے کارن مجاز زندگی میں تین بار دماغی بیماری کا شکار ہوئے اور ایک بار تو رانچی کے پاگل خانے میں بھی رہے۔

عصمت چغتائی کے الفاظ میں گرلز کالج میں مجاز کے نام کی لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس کے اشعار تکیے کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور کنواریاں اپنے مستقبل میں ہونے والے بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں، نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں... ؟

ہوسکتا ہے کہ اس میں عصمت نے کچھ مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہو؟ مگر کچھ حد تک ہو بھی سکتا ہے۔ مگر وہ مجاز کی نہیں اس کی شاعری کے سحر میں گرفتار تھیں۔ جیسے لوگ اداکاروں اور فنکاروں کے فن کے گرویدہ و پرستار ہوتے ہیں؟ عملی زندگی میں ان کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ اور وہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ لڑکیاں کھلے طور پر اپنے عشق کا اظہار

www.taemeernews.com

کریں۔ اور ان دنوں لو میرج تو شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی بلکہ والدین کی مرضی کی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ اور کسی لڑکی میں جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ماں باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرے۔ ساحر لدھیانوی کو بھی اس کا احساس تھا تبھی تو اُس نے کہا تھا:

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اور اگر بالفرض کوئی لڑکی مجاز سے شادی کے لئے تیار بھی ہوتی تو کیا کوئی والدین اپنی دخترِ ارجمند کی شادی کسی بے روزگار، شراب کے علت میں گرفتار، سے اپنی بیٹی کی شادی کر دیتے۔ نہیں ہرگز نہیں۔

مجاز کی موت ایک عظیم سانحہ ہے۔ جس میں صرف شراب کا ہی دخل نہیں ہے بلکہ اس کے ہم مشرب دوستوں کا بھی ہے جو اُس کی بذلہ سنجی اور شاعری کی وجہ سے اسے پلاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شراب نوشی اس کے لئے زہر ہلاہل ہے مگر اس کے باوجود وہ اسے پیہم پلاتے رہے.....

'' ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟''

ناکامیوں اور مایوسیوں نے مجاز کو زندہ درگور کر دیا۔ وہ جیتے جی مر گئے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ شراب پینے لگے اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں کو بھلانے کے لئے۔

اور پھر..... ملازمت کے میدان میں بھی اُنہوں نے مسلسل ناکامی کا منہ دیکھا۔

وہ چاہتے تھے اُن کا اپنا گھر بار ہو۔ اُن کی ایک بیوی ہو، بچے ہوں مگر افسوس جس شخص پر بے شمار لڑکیاں جان دیتی تھیں اور شادی کرنے کی آرزو رکھتی تھیں کوئی بھی آگے نہ بڑھی کہ اس کا ہاتھ تھام لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے بے اندازہ شراب کا استعمال شروع کر دیا اور آخر اس نے اس کی جان لے لی۔

اگر ان ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے شراب کا سہارا لینے کے بجائے انہوں نے اسے اپنے تخلیقی جوہر نمایاں کرنے میں صرف کیا ہوتا تو شاید آج انہوں نے ہمیں '' آوارہ'' ایسی کئی شاہکار نظمیں عطا کی ہوتیں مگر اس کے بجائے وہ

www.taemeernews.com

زہر کی صورت میں شراب کے جام اپنے اندر انڈیلتے رہے جنہوں نے سمِ قاتل بن کر ان کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔

ان دنوں کی مجاز کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ عصمت چغتائی نے بعد ازاں ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ: ۱۹۴۴ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مجاز کا ستارۂ شاعری ڈوب چکا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر کوئی مشاعرہ تھا۔ تمام شعراء تو موجود پر آپ نہ جانے کہاں غائب؟ شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ لائے اور کرسی پر ٹکا دیا۔ اب حلیہ ملاحظہ ہو۔ میلا چست پاجامہ کان میلیا جیسا۔ اس پر بے تکا سا اوور کوٹ۔ گلے میں چیکٹ مفلر اور..... واہ! مائیکروفون پر جا کر نہ جانے کیا اول فول بکنے لگے۔ کلیجے میں آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا۔ ایک پاؤں زمین پر تو دوسرا آسمان پر۔ کبھی ایک دائیں تو دوسرا بائیں کونے میں۔ ایک ہاتھ مشین کی سی رفتار سے بالوں کی ایک ریت آلود لٹ کو بار بار کنپٹی پر سے اُٹھائے جا رہا تھا۔ اور وہ بے حیائی سے گرے جا رہی تھی۔ اب خوش الحانی شروع۔ اللہ جانے کیوں اور کیا بکنا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں دانت بھینچ کر کیا لیکچر دیتے تھے۔ ٹہلتے ہوئے مائیکروفون سے دُور نکل گئے۔ واپس لانے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔

کیا ایسے شخص کو کوئی ریڈیو افسر یا عام مشاعرے کا ناظم برداشت کرے گا کہ کوئی شاعر چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، آکر اس میں ہڑبونگ مچا دے؟ سنا ہے کئی بار ایسا ہوا۔ ساحر لدھیانوی نے ایک بار بمبئی کے فینس سینے لیبارٹری کی کینٹین میں مجھے اور مرحوم اظہار ملیح آبادی کو بتایا تھا کہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر جب مجاز کا نام پکارا گیا تو معلوم ہوا کہ مجاز غائب ہیں۔ بقول ساحر وہ انہیں ڈھونڈنے گئے تو وہ کینٹین میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ساحر بڑی مشکل سے اسے ریڈیو اسٹیشن لائے مگر وہ آنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

درحقیقت مجاز اپنے آپ کو سماج کے مطابق بنانے کے اہل نہیں رہے تھے اور سماج کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی فرد کے خیالات و افکار کے مطابق خود ڈھل جائے؟ انہیں ملازمتیں بھی ملیں لیکن وہ ان کی پابندیوں اور انضباط کے دائرے

www.taemeernews.com

میں نہ رہ سکے۔ اور اپنی بے قاعدگی اور لاأبالی پن کی وجہ سے ان کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملازمت کے میدان میں ناکام ہو گئے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے..... ہمارے سماج میں آپ کی لیاقت اور علمیت وفضیلت سے عزت نہیں ہوتی بلکہ اس سے ہوتی ہے کہ آپ کیا کماتے ہیں اور آپ کے پاس کتنا پیسہ ہے۔ اگر آپ ایک عظیم شاعر ہیں تو اپنی جگہ۔ سماج کو اس سے کیا لینا؟ اگر کوئی پوچھے کہ آپ کیا کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ شاعری یا افسانہ نویسی کرتے ہیں بلکہ یہ جواب دینے پر وہ یہی پوچھے گا کہ ارے بھئی کام کیا کرتے ہو؟ آپ کے جانکاروں یا رشتہ داروں کے نزدیک افسانہ نویسی یا شاعری کوئی کام نہیں۔ اس لئے بڑا شاعر ہونے پر بھی مجاز اس میدان میں ناکام رہے کیونکہ ان کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ اور ایک حد تک وہ سماج کی نظر میں آوارہ، بے روزگار اور حد سے زیادہ پینے والے میخوار تھے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ صرف ۴۶ سال کی عمر میں مجاز اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ ان کی مرنے کی عمر نہ تھی۔ لیکن مجاز کو معلوم تھا کہ جلد ہی موت سے وہ گلے ملنے والے ہیں تبھی تو انہوں نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں میں
موت آواز دے رہی ہے مجھے

شاید موت نے انہیں آواز نہیں دی تھی بلکہ اُنہوں نے موت کو خود لبیک کہا تھا اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا اور حقیقتاً وہ مرے نہیں تھے بلکہ کثرت مے نوشی سے انہوں نے اپنی صحت کو بگاڑ کر ایک طرح سے خودکشی کر لی تھی۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

محمد طفیل

پیدائش: ۱۴/اگست ۱۹۲۳ء، لاہور (پنجاب)

وفات: ۵/۴ جولائی ء، اسلام آباد (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

محمد طفیل: ایک مطالعہ

اُردو ادبی صحافت میں جو مقام علامہ نیاز فتح پوری مدیر ''نگار'' اور محمد طفیل ایڈیٹر ''نقوش'' کو حاصل ہوا وہ کسی اور ادبی رسالے کے مدیر کو شاید نہ مل سکا۔ اول الذکر کا آفتابِ شہرت حصولِ آزادی سے پہلے عروج میں تھا جبکہ موخر الذکر کا آزادی کے بعد لیکن قلیل عرصے میں ہی آسمانِ ادب پر ایسا چمکا کہ سب کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میدان میں طفیل صاحب نے اپنے کارہائے نمایاں سے وہ بلند مقام حاصل کر لیا جو کسی اور ادبی مدیر کو حاصل نہ ہو سکا تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

طفیل صاحب کی ولادت ۱۴ر اگست ۱۹۲۳ء کو لاہور میں ہوئی تھی اور انہوں نے ''نقوش'' کا اجراء ۱۹۴۹ء کے نصف آخر میں کیا لیکن تب وہ خود اس کے ایڈیٹر نہیں بنے۔ شاید اس کی وجہ یہ احساس ہو کہ رسالے کی مقبولیت و شہرت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ممتاز و نامور ادبی شخصیت ہی اس کی مدیر ہو۔ بہر حال وجہ کوئی بھی ہو، انہوں نے اس رسالے کی ادارت کے فرائض مشہور و مقبول افسانہ نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کو سونپے۔ بعد ازاں کچھ شمارے وقار عظیم کی ادارت میں منظر عام پر آئے۔ پھر ۱۸ شماروں کی اشاعت کے بعد اپریل ۱۹۵۱ء میں ''نقوش'' کی ادارت انہوں نے خود سنبھال لی۔ اُس وقت بیشتر افراد کا خیال تھا کہ وہ اس ذمہ داری کو بخوبی

www.taemeernews.com

انجام نہیں دے پائیں گے اور انہیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ لیکن اپنی سوجھ بوجھ محنت اور کاوش سے انہوں نے مختصر مدت میں ایسے تمام اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا۔ اور "نقوش" کے ضخیم اور یادگار نمبر نکال کر ادبی صحافت میں منفرد اور غیر معمولی مقام حاصل کر لیا۔

تاہم ایسا نہیں ہے کہ طفیل صاحب کو اس رسالے کی ادارتی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو۔ شروع شروع میں انہیں کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا اور مختلف قسم کے تلخ تجربوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ جیسا کہ انہوں نے خود تحریر کیا ہے:

"جب میں نقوش کی ادارتی ذمہ داریوں میں نیا نیا پھنسا تھا تو مجھے اس گھٹیا منصب کے اسرار و رموز اور نزاکتوں کا قطعی علم نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس باب میں کون میری مدد کرے گا اور کون ٹانگ کھینچے گا۔ مدیرانہ فرائض کو میں نے گھٹیا اس لئے کہا کہ آج کوئی بھی خوددار انسان کسی اپنے رسالے کا مدیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بیشتر لکھنے والے پارٹی بازیوں کا شکار ہیں۔ (ادب اور پارٹی بازی! سبحان اللہ)۔ خدانخواستہ کوئی مدیر اگر کسی لکھنے والے سے سلام دعا کرتا ہوا پکڑا جائے تو سمجھ لیجئے کہ اس ادیب کے جتنے بھی مخالف ہیں وہ سب دفعتاً مدیر کے حصے میں آ گئے۔"

(نقوش شخصیات نمبر ا صفحہ ۳۳۸)

طفیل صاحب نے زائد از ۳۴ برس (۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء تا جون ۱۹۸۵ء) نقوش کی ادارت کی۔ اس عرصہ میں اشاعت پذیر تمام شماروں اور خصوصی نمبروں کی تعداد ۸۵ ہے۔ یہ لگ بھگ ۵۴ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ گو صفحات کی تعداد کو اس سلسلے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں لیکن اس مدت میں شائع ضخیم اور اہم خصوصی نمبر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

افسانہ نمبر	۴۰۰ صفحات	ستمبر ۱۹۵۲ء
افسانہ نمبر	۵۰۴ صفحات	جنوری ۱۹۵۴ء

www.taemeernews.com

افسانہ نمبر (دو جلدیں)	۱۰۹۰ صفحات	دسمبر ۱۹۵۵ء
افسانہ نمبر	۷۰۴ صفحات	نومبر ۱۹۶۰ء
افسانہ نمبر	۶۷۶ صفحات	نومبر ۱۹۶۸ء
افسانہ نمبر	۵۷۵ صفحات	ستمبر ۱۹۷۴ء
غزل نمبر	۴۸۰ صفحات	مئی ۱۹۵۴ء
ضمیمہ غزل نمبر	۲۵۶ صفحات	جولائی ۱۹۵۴ء
غزل نمبر اضافہ شدہ	۲۵۲ صفحات	جنوری ۱۹۶۰ء
پنجسالہ نمبر	۴۰۸ صفحات	فروری ۱۹۵۳ء
دس سالہ نمبر	۴۵۴ صفحات	اگست ۱۹۵۸ء
شخصیات نمبر (حصہ اول)		
شخصیات نمبر (حصہ دوم)	۸۱۶ صفحات	اکتوبر ۱۹۵۶ء
سالنامہ	۳۸۴ صفحات	جنوری ۱۹۵۷ء
سالنامہ	۶۰۸ صفحات	جنوری ۱۹۶۳ء
جنگ نمبر (تین جلدیں)	۱۲۲۴ صفحات	اپریل ۱۹۶۶ء
جنگ نمبر	۵۲۸ صفحات	جولائی ۱۹۷۳ء
جنگ نمبر	۵۳۰ صفحات	جنوری ۱۹۷۹ء
جنگ نمبر	۴۸۰ صفحات	دسمبر ۱۹۸۴ء
جنگ نمبر	۷۱۰ صفحات	جون ۱۹۸۵ء
مکاتیب نمبر (دو جلدیں)	۱۰۴۸ صفحات	نومبر ۱۹۵۷
طنز و مزاح نمبر	۹۲۸ صفحات	فروری ۱۹۵۹ء
پطرس نمبر	۶۴۰ صفحات	ستمبر ۱۹۵۹ء
ادبِ عالیہ نمبر	۱۲۷۰ صفحات	اپریل ۱۹۶۰ء
لاہور نمبر	۱۲۰۴ صفحات	فروری ۱۹۶۲ء
شوکت تھانوی نمبر	۶۲۴ صفحات	ستمبر ۱۹۶۳ء

آپ بیتی نمبر (دو جلدیں)	۱۹۶۴ صفحات	جون ۱۹۶۴ء
خطوط نمبر (تین جلدیں)	۲۰۱۷ صفحات	اپریل ۱۹۶۸ء
غالب نمبر۔۱	۸۴۰ صفحات	فروری ۱۹۶۹ء
غالب نمبر۔۲	۳۸۸ صفحات	اکتوبر ۱۹۶۹ء
غالب نمبر۔۳	۶۱۲ صفحات	ستمبر ۱۹۷۱ء
اقبال نمبر۔۱	۵۵۷ صفحات	ستمبر ۱۹۷۷ء
اقبال نمبر ([illegible])	۶۰۰ صفحات	نومبر ۱۹۷۷ء
اقبال نمبر۔۲	۶۵۴ صفحات	دسمبر ۱۹۷۷ء
میر نمبر۔۱	۶۳۲ صفحات	اکتوبر ۱۹۸۰ء
میر نمبر۔۲	۶۴۰ صفحات	نومبر ۱۹۸۰ء
میر نمبر۔۳	۵۷۲ صفحات	جولائی ۱۹۸۳ء
ادبی معرکے نمبر (۲ جلدیں)	۱۲۸۸ صفحات	ستمبر ۱۹۸۱ء
میر انیس نمبر	۷۲۸ صفحات	نومبر ۱۹۸۱ء
عصری ادب نمبر	۸۶۰ صفحات	ستمبر ۱۹۸۲ء
رسول نمبر (۲ جلدیں)	۱۵۷۶ صفحات	دسمبر ۱۹۸۲ء
رسول نمبر (۲ جلدیں)	۱۵۰۰ صفحات	جنوری ۱۹۸۳ء
رسول نمبر (۲ جلدیں)	۱۵۲۰ صفحات	دسمبر ۱۹۸۳ء
رسول نمبر (۳ جلدیں)	۳۰۱۲ صفحات	جنوری ۱۹۸۴ء
رسول نمبر (۳ جلدیں)	۲۱۰۰ صفحات	جنوری ۱۹۸۵ء

ان ضخیم نمبروں کی ادارت و ترتیب سے انہوں نے ایسی روایت قائم کی جس کی مثال برصغیر کی دوسری زبانوں کے ادبی رسائل میں بھی شاید ہی ملے۔انہوں نے بحیثیت مدیر اتنا کام انجام دیا جتنا شاید ہی کسی دوسرے مدیر نے انفرادی طور پر انجام دیا ہو۔انہوں نے جن موضوعات پر خصوصی نمبر ترتیب دیئے، اُن کے مطالعے کے بغیر ان موضوعات پر تحریر و تحقیق کا کام ادھورا رہے گا۔ایک طرح سے انہوں نے

www.taemeernews.com

ہماری ادبی تاریخ کو ترتیب دے کر ''نقوش'' کے صفحات میں اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ آئندہ نسلیں صرف ان سے مستفید ہی نہیں ہوں گی بلکہ ان کے کارہائے نمایاں پر انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔

طفیل مرحوم نے نقوش کے صفحات کو کبھی اپنی شہرت و مقبولیت کے لئے استعمال نہیں کیا۔ جبکہ اکثر مدیر اپنے رسائل کو اپنی تصاویر و مضامین سے مزین کر کے اپنی شخصیت کو غیر معمولی اور قدِ آدم بنانے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ طفیل صاحب نے جب ''نقوش'' کا آپ بیتی نمبر شائع کیا تو اس میں لگ بھگ ڈھائی صد مشہور و معروف شخصیات کی آپ بیتیاں شامل کیں جن میں اولیاء، صوفیاء، علماء، مورخ، سربراہانِ مملکت، سیاست داں، مصلحین، ادباء وشعراء اور غیر ملکی مشاہیر شامل تھے اگر وہ چاہتے تو اس خصوصی شمارے میں اپنی آپ بیتی بھی شامل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں متعدد دوستوں نے اس طرح کا مشورہ دیا تھا کہ اس نمبر میں اپنی آپ بیتی ضرور شامل کرنا، زندۂ جاوید ہو جاؤ گے۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس سلسلے میں ان کا جواب تھا کہ۔ ''اگر یہ نمبر زندۂ جاوید نہیں بنا سکتا۔ تو میری آپ بیتی بھی مجھے زندگی نہ بخش سکے گی۔ کیونکہ کسی کا مرنا اور جینا اس کے کام اور مقاصد پر منحصر ہوتا ہے۔ جتنے لوگ چل پھر رہے ہیں مجھے انہیں زندہ سمجھنے میں تامل ہے اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں مجھے انہیں مردہ سمجھنے کا کوئی حق نہیں

(تصریحاتِ نقوش آپ بیتی نمبر)

متذکرہ بالا نمبر کی تیاری میں انہوں نے دیوانگی کی حد تک محنت و کاوش کی اور اس کے لئے ایسی ایسی عظیم المرتبت ہستیوں سے مضامین لکھوائے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اس یادگار نمبر کے لئے ''اللہ میاں'' سے بھی آپ بیتی لکھوا لیتے۔ جیسا کہ انہوں نے آپ بیتی میں ''طلوع'' کے عنوان سے لکھا تھا:

''مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میرا پاگل پن کبھی مجھے اس حد تک رُسوا کرے گا کہ مَیں جھونپڑیوں میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھوں گا..... چلو چھوڑیں اس بات کو۔ مَیں تو یہ کہنے چلا تھا کہ اس گنہگارِ ادب نے اب کے بڑے ادیبوں کے ساتھ

www.taemeernews.com

بڑے لوگوں سے بھی مدد چاہی۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں ہے کہ ادبی بادشاہوں کے ساتھ دنیاوی بادشاہوں کے ساتھ بھی ملاقات کر لی جائے۔ بادشاہ تو بادشاہ، میں تو اس مضمون کے لئے اللہ میاں سے بھی مضمون لکھوانے کا ارادہ کرتا، بشرطیکہ اس پر قدرت رکھتا۔

''ایک طفلانہ سی بات یاد آ گئی۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا کہ ایک معصوم بچے نے اپنی ماں سے پوچھا تھا۔ ''اماں! میرے ابا کہاں ہیں؟''

''اللہ میاں کے پاس''

چنانچہ اس بچے نے ابا کو خط اللہ میاں کی معرفت بھیجا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس نمبر کے سلسلے میں اُس یتیم بچے والی معصومیت کو شعوری صورت دے دیتا۔ لوگ نادان ہی تو کہتے۔''

خصوصی نمبروں کے سلسلے میں ان کا آخری کارنامہ تیرہ جلدوں میں ''رسول نمبر'' کی اشاعت ہے جو تقریباً ۹۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی تنہا محنت و کاوش سے اسے یادگار نمبر بنا دیا ہے۔ اس میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی پُر از معلومات تحریریں بھی شامل ہیں۔ اس نمبر کو اپنی اہمیت و افادیت سے ایک ایسے انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے کہ مستقبل میں کسی بھی پہلو پر لکھتے وقت اس نمبر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ جب کبھی ادبی رسائل کی تاریخ قلمبند کی جائے گی ''نقوش'' اور اس کے مذکورہ بالا نمبروں کا ذکر سر فہرست ہوگا۔

رسول نمبر کے بعد اُن کا ارادہ 'قرآن نمبر'' نکالنے کا تھا اور اس سلسلے میں وہ لاہور سے پشاور اور پشاور سے اسلام آباد پہنچے تھے جہاں وہ اپنے دوست احسن علی خاں صاحب (افسانہ نگار اختر جمال کے شوہر) کے یہاں مقیم ہوئے، مگر افسوس کہ وہ ۵/۴ جولائی ۱۹۸۶ء کی رات کو ایسے گہری نیند سوئے کہ صبح انہیں بیدار ہونا نصیب نہ ہوا۔ رات میں کسی وقت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وہ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گئے۔

www.taemeernews.com

یوں تو طفیل صاحب کو اُردو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے ''نقوش'' کے نمبر ہی کافی تھے لیکن ایک ممتاز و نامور مدیر ہونے کے علاوہ وہ ایک منفرد اور صاحب اسلوب خاکہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے ''صاحب''، ''جناب''، ''آپ''، ''محترم''، ''معظم''، ''مکرم''، ''مجی'' اور ''مخدومی'' ایسی تصانیف سے اُردو خاکہ نگاری میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس سے پیشتر فرحت اللہ بیگ، اشرف صبوحی، چراغ حسن حسرت، رشید احمد صدیقی، اشفاق احمد، اخلاق احمد دہلوی، شورش کاشمیری، سعادت حسن منٹو وغیرہ نے خاکہ نگاری کے فن کو غیر معمولی طور پر آگے بڑھایا ہے، لیکن اس میدان میں طفیل صاحب کے کارنامے بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو اتنے خاکے عطا کئے کہ دوسرے سبھی خاکہ نگاران سے بہت پیچھے رہ گئے۔ مشاہیر اور ہم عصر ادباء و شعراء کے بارے میں اُن کے یادگار خاکے اپنے اختصار کے باوجود مختصر افسانے کی دلکشی اور جاذبیت رکھتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ محض چند لفظوں پر مشتمل جملے میں وہ بہت بڑی بات کہہ جاتے ہیں جس کی تشریح و توضیح کے لئے صفحے درکار ہوتے ہیں۔ وہ بوجھل سے بوجھل اور دقیق سے دقیق بات کو ہلکے پھلکے لطیف اور دل نشیں انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''شاہد صاحب کے جتنے بھی معرکے ہوئے وہ ہم بے زبان پنجابیوں کے ساتھ مگر آخر میں وہ اُس داغ کو دھو گئے، جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال کر۔''

اس طرح جمیل الدین عالی کے بارے میں ''محترم'' میں لکھتے ہیں:

''ڈکٹیٹرانہ شان رکھنے والے مگر مصلحت آمیزی میں طاق۔ معاملہ فہم مگر ضد کے بادشاہ۔ مخلص اتنے کہ مسکرا مسکرا کر رِجھا دیں۔ جانبدار اتنے کہ اصول شرما جائیں۔ رائٹرز گلڈ کے ناخدا مگر خود گلڈ کی دریافت۔''

جوش ملیح آبادی کے خاکے میں یوں رنگ بھرا ہے:

''جاگیردارانہ نظام کی پیداوار مگر خود اس نظام کے جانی دشمن۔ بھاری بھرکم

www.taemeernews.com

شخصیت، بھاری بھرکم کلام، ہلکا پھلکا مزاح، ہلکا پھلکا مذاق۔ نہ اچھے دوست نہ اچھے دشمن۔''

اسی طرح کے بے شمار دل نشین، دل کش اور دل پذیر خاکے اُنہوں نے تحریر کئے اور اپنے عہد کی لگ بھگ سبھی معروف ہستیوں کی اپنے قلم سے ایسی تصویر کھینچی ہے جو منہ بولتی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے بابائے اُردو، قاضی عبدالغفار، یگانہ چنگیزی، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی، جمیل الدین عالی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، احسان دانش، شوکت تھانوی، عابد علی عابد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، میرزا ادیب، انتظار حسین، پطرس بخاری، مجاز لکھنوی، اے حمید اور ناصر کاظمی کے علاوہ متعدد شخصیات کے خاکوں سے ہمیں نوازا جنہیں پڑھ کر ہم ان حضرات کے بارے میں ان گنت باتیں جان پاتے ہیں اور اُن سے متعلق ایک رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ خاکے مصنف کی انفرادیت اور کمالِ فن کے شہ پارے ہیں۔ انہیں خاکہ نگاری کی صنف میں ایسا مقام حاصل ہے جس تک رسوائی کا رِدشوار ہے۔

طفیل صاحب نے اُردو ادب میں جو مقام و مرتبہ پایا، وہ ان کے خلوص، لگن اور محنت و کاوش کا مرہونِ منت ہے جن کی بدولت وہ ایک غیر معمولی مدیر اور ایک منفرد خاکہ نویس کے مرتبے تک پہنچے۔ ورنہ اُن کی ابتدائی زندگی کیا تھی۔ انہوں نے شروع میں کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر ادارہ ''فروغِ اُردو'' نامی اشاعتی گھر کی بنیاد ڈالی جہاں سے بے شمار ادبی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ حصولِ آزادی کے بعد انہوں نے ''نقوش'' ایسے رسالے کی شروعات کی جس کے ضخیم نمبروں نے ادبی رسائل کی ایک نئی روایت قائم کی اور ادبی صحافت میں ایک مثالی مقام حاصل کیا۔

گو طفیل صاحب کو بحیثیت خاکہ نویس کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا تاہم انہیں زندۂ جاوید ''نقوش'' کے ضخیم نمبروں نے کیا ہے جن کی اہمیت و افادیت سے اُن کا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا اور جن کے مطالعے کے بغیر شاید کسی شخصیت یا ادبی موضوع پر تحقیقی کام کی تکمیل ممکن نہیں۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

منیر نیازی

پیدائش: ۹؍اپریل ۱۹۲۷ء ہردوخانپور ضلع ہوشیار پور (پنجاب)

وفات: ۲۶؍دسمبر ۲۰۰۶ء لاہور (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

منیر نیازی اور ان کی شاعری

ایک سرسری جائزہ

شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ آزادی کے بعد پاکستان میں جن تین شعراء کو اُردو شاعری کے میدان میں بے پناہ شہرت ملی اُن تینوں کی جائے پیدائش بھارت کی ریاست پنجاب و ہریانہ سے تھا۔ ان میں سے ناصر جاظمی کی ولادت ہریانہ کے شہر انبالہ میں ہوئی تھی اور حبیب جالب اور منیر نیازی کی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں اور آزادی سے پیشتر یہ تینوں ان ہی مقامات پر سکونت پذیر تھے مگر آزادی کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔

گو آج یہ تینوں شعراء اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے لاہور میں ابدی نیند سو چکے ہیں مگر اپنے منفرد انداز و اسلوب کی بدولت انہوں نے اُردو شاعری میں وہ بلند مقام پالیا تھا کہ ان کے ذکر کے بغیر اُردو شاعری کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

منیر نیازی کے آبا و اجداد نسلاً پٹھان تھے اور تلاش معاش میں غزنی سے یہاں آ کر خان پور پٹھاناں میں آباد ہو گئے تھے جہاں ۹/ اپریل ۱۹۲۷ء کو منیر کی پیدائش ہوئی اور والدین نے اُن کا نام منیر احمد رکھا۔

www.taemeernews.com

اگر چہ ان کا خاندانی پیشہ ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا تاہم ان کے والد محمد فتح خان محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے۔ مگر ابھی منیر صرف ایک برس کے ہی تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد ان کے آدھ درجن سے زائد چچاؤں نے اُن کی تعلیم و تربیت میں بڑی دلچسپی لی۔ کوئی ان کو فوج میں بھیجنے کا خواہشمند تھا تو کوئی ٹرانسپورٹ میں۔ منٹگمری (حال ساہیوال) سے میٹرک کرنے کے بعد بطور سیلر نیوی میں ملازم ہو گئے۔ مگر لگ بھگ دو سال تک ملازمت کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر بہاولپور کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ لاہور آ گئے اور دیال سنگھ کالج سے بی اے کیا۔

تقسیم ملک کے بعد ان کا خاندان ہوشیار پور سے نقلِ مکانی کر کے منٹگمری میں آباد ہوگیا جہاں سے ۱۹۴۹ء میں وہ مکتبہ ارژنگ (ارژنگ) کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ اور ایک بک اسٹال بھی چلاتے رہے۔ مگر تنظیمی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ لہٰذا چند برس بعد اس کاروبار کو بند کر کے وہ لاہور آ گئے جہاں وہ نوائے وقت، امروز اور زمیندار میں بطور کالم نویس کام کرتے رہے۔ اسی دوران ان کی ملاقات معروف شاعر مجید امجد سے ہوئی جو بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی اور ان دونوں نے مل کر ''سات رنگ'' نامی رسالہ نکالا جو بعد میں بند ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ''المثال'' نامی اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔

منیر نیازی اپنے دوست فلم ہدایت کار ریاض شاہد کی وساطت سے فلموں میں آئے تھے اور انہوں نے فلم دنیا کو کئی یادگار گیت بھی دئے جیسے..... ''جس نے میرے دل کو درد دیا اُس شخص کو مَیں نے بھلایا نہیں''..... ''کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلائے جاتے ہیں'' اور ''اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو''..... جسے نسیم بیگم نے گایا تھا۔ یہ نغمے فلم بینوں میں بہت مقبول ہوئے مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی فلمی صنعت سے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ انہیں حسب وعدہ معاوضہ نہیں

www.taemeernews.com

دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آخر الذکر نغمے کے لئے فلمساز نے انہیں دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں انہیں صرف دو سو روپے دے کر ٹرخا دیا گیا۔

فلمسازوں کی طرح وہ پاکستان کے ناشرین سے بھی ناخوش و شاکی تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ نہ تو معاوضہ دیتے ہیں نہ اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع کرتے ہیں اور نہ ہی شائع شدہ کتابوں کی چند کاپیاں دیتے ہیں جبکہ امریکہ میں تو اُن کی شاعری کی کتابیں بڑی اچھی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں اور انہیں معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔

منیر نیازی نے اُردو میں ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں دشمنوں کے درمیاں شام، تیز ہوا اور تازہ پھول، ماہِ منیر، آغازِ زمستاں میں دوبارہ، چھ رنگین دروازے، جنگل میں دھنک، ایک مسلسل، پہلی بات ہی آخری تھی، ساعت سیار، ایک دعا جو مَیں بھول گیا، سفید دن کی ہوا، سیاہ شب کا سمندر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی میں بھی ان کی کئی مطبوعات منظر عام پر آئیں جن میں چار چپ چیزاں (پنجابی غزلیں) سفر دی رات (پنجابی نظمیں) رستہ دسن والے تارے (پنجابی غزلیں) کل کلام (تمام پنجابی شاعری کا انتخاب)، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری کو روسی، انگریزی، نارویجین، جرمن اور کئی دیگر یورپی زبانوں میں شائع ہونے کا فخر نصیب ہوا۔

منیر میں انا کے ساتھ ساتھ اُس میں مستحکم اردگی اور مصائب سے نبرد ہونے کا بلند حوصلہ بھی ہے اس لئے وہ للکارتے ہوئے چیلنج دے کر کہتے ہیں:

میری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پر جھیل کے دیکھے
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالہ
مَیں ہی وہ ہوں جس کی چتا سے گھر گھر ہوا اُجالا

مذکورہ بالا اشعار سے یہ بات بھی ہم پر واضح ہوتی ہے کہ وہ چتا۔، ہولی

www.taemeernews.com

ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔

منیر نیازی کی شاعری کے بارے میں مرحوم احمد ندیم قاسمی نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

''قدرت کے خارجی مظاہر پر اُردو میں بھی بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں اور اشعار کہے گئے ہیں مگر جس شاعر کے ہاں خارجی کائنات انسان کی باطنی کائنات کا ایک ناگزیر حصہ بن گئی ہے، وہ اس دور میں منیر نیازی ہی ہے۔اس کی نظمیں (اور غزلیں بھی) دیکھیے تو فوری تاثر یہ ہوگا کہ شاعر اپنے مشاہدے کے کمالات دکھا رہا ہے مگر پھر یکا یک آپ کو معلوم ہوگا کہ ان درختوں، ان پتوں اور پھولوں، ان سورجوں اور دھوپوں، ان پہاڑوں اور دریاؤں ان گھروں اور گلیوں، ان رنگوں اور بے رنگیوں میں سے ایک ایک میں ایک نہ ایک نہایت نازک مگر بنیادی انسانی جذبہ یوں گھلا ہوا ہے جیسے رنگ میں خوشبو گھلی ہوتی ہے۔منیر کی شاعری مشاہدے کی شاعری نہیں ہے۔یہ مشاہدات تو اس کے محسوسات کا صرف پس منظر فراہم کرتے ہیں۔احساس کا یہ منقش اظہار منیر نیازی کی شاعری کا منفرد اسلوب ہے۔''

منیر کی شاعری میں تنہائی کا اتنا کرب پایا جاتا ہے کہ بعض ناقدین اسے تنہائی کا شاعر کہتے ہیں۔مگر اسے پوری طرح صحیح نہیں مانا جا سکتا کیونکہ اگر ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ انتہائی کے خول میں بند نہیں۔ بلکہ کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔اور اگر وہ تنہا ہیں تو وہ بڑے شہروں کی دین ہے جہاں بھیڑ میں کھڑے لوگ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور جن سے نالاں ہو کر اُنہوں نے کہا تھا کہ'' اس شہرِ بے وفا کو جلا دینا چاہیے''۔۔شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا:

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہر در بند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

www.taemeernews.com

شہر در بند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

منیر کی شاعری میں 'سفر'.....'ہوا'.....'شام'.....اور 'موت' کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ وہ اپنی یادوں اور تخیل میں کھو کر نہ جانے کہاں کہاں کا سفر کرتے ہیں اور کہاں کہاں کے نظارے دیکھتے ہیں۔ سفر کا یہ حال ہے کہ ریل کی سیٹی سے بھی اُن کا دل لہو ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھئے:

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیرؔ
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

اپنے گھروں سے دُور بنوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لوگو
کبھی کبھی وقت ملے تو اپنے گھر بھی جاتے رہنا

☆

تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشم حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

☆

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں ہی تو ہے

منیرؔ کی شاعری کے مطالعہ سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کی شاعری ماضی اور حال کے حسی اور ذہنی تجربوں اور مشاہدات پر مبنی ہے اور اس میں وہ عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں شہروں کی مصنوعی اور مشینی زندگی سے بیزاری اور مایوسی کا اظہار ملتا ہے اور شہری ماحول کے مناظر میں بسوں کے دم گھونٹ دینے والے دھوئیں، تنگ و تاریک اور متعفن گلیوں، غیر انسانی رویے اور دم توڑتی اقدار کی تصویر کشی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیہی زندگی کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ وہی کام جو احمد ندیم قاسمی نے دیہی زندگی کی

www.taemeernews.com

عکاسی میں اپنے افسانوں میں کیا ہے وہی منیر نے دیہی زندگی کے اظہار و بیان میں کیا ہے۔ انہیں گاؤں کے فطری حسن، وہاں کے لوگوں کی معصوم، سادہ اور بے ریا زندگی اور کیف آور ماحول کی یاد تڑپاتی ہے جہاں کوئل کی کوک، مسجدوں سے اذان کی آواز، چڑیوں کی چہکار، ہرے بھرے کھیت اور کچے پکے مکان ایک مسحور کن مناظر پیش کرتے ہیں۔

وہ ملک کی صورتِ حال سے بھی متفکر رہتے تھے اور اشاروں کنایوں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے جیسے وطن کی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے؟
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے اُن کی ایک پنجابی نظم کے کچھ اشعار یاد آرہے ہیں کہ:

کجھ انج وی راہواں اوکھیاں سن　　کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن　　کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

یعنی کچھ تو ویسے ہی راستے بہت دشوار تھے، کچھ گلے میں طوقِ غم پڑا ہوا تھا، کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے اور کچھ ہمیں بھی مرنے کا شوق تھا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

نارنگ ساقی، کرشن لال

پیدائش: ۲۴ راگست ۱۹۳۶ء، سوڈھی نگر فیروز پور، پنجاب)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ادب دوست اور ادب نواز

نارنگ ساقی

معروف ادب دوست اور ادب نواز نارنگ ساقی جنہیں دنیا بھر کے اُردو شعراء وادبا خاص کر پاکستانی اہلِ ادب میں اپنی میزبانی کی بدولت غیر معمولی شہرت حاصل ہے، میرے بہت ہی قریبی اور عزیز دوست ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میرے لئے ان پر کوئی مضمون لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس لئے جب بھی مضمون کے تقاضے کے لئے ٹیلی فون آتا ہے تو مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوتا ہے، کئی بار قلم بھی اُٹھایا کہ آج ساقی صاحب پر مضمون لکھ کر ہی دم لوں گا مگر سمجھ نہیں آیا کہ کیا لکھوں؟ کیونکہ ان کی زندگی اور ادبی کارناموں پر پروفیسر گوپی چند نارنگ، ساقی فاروقی، پروفیسر قمر رئیس، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ، مجتبیٰ حسین، اظہر جاوید، ایسے بڑے بڑے نقاد ادیب اور شاعر اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اب لکھنے کی شاید اور گنجائش ہی نہیں بچی اور پھر ان حضرات کے سامنے میری تحریر کی کیا

www.taemeernews.com

بساط؟ یہ لوگ پہلے ہی اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ کوئی ایسی نئی بات ذہن میں نہیں آرہی جو میں ان کے بارے میں لکھوں۔ کیونکہ ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین پڑھ کر سبھی اس بات سے آگاہ ہیں کہ ساقی صاحب کا حقیقی نام کرشن لال نارنگ ہے اور جب انہیں ادیب بننے کا شوق چرایا تو انہوں نے پہلے وفاؔ تخلص اختیار کیا اور پھر ''ساقی'' نام کا ایک ادبی رسالہ بھی نکالا۔ بعد ازاں دیگر ادبی رسائل کی طرح اس رسالے نے بھی جلد ہی دم توڑ دیا لیکن اس کے بعد ان کے نام کے ساتھ وفاؔ کی جگہ ساقی تخلص چسپاں ہو کر رہ گیا۔

پھر کئی بار سوچا، اُن کی مہمان نوازی اور ساقی گری کے واقعات کو ہی قلمبند کر دوں مگر وہ بھی لکھنے کا کیا فائدہ کہ سارے برِصغیر کے ادبی حلقوں میں پہلے ہی اس کی دھوم مچی ہوئی ہے اور کوئی ایسا ادیب نہیں جو اُن کی مہمان نوازی سے واقف نہ ہو اور جب بھی پاکستان یا کسی اور ملک سے اُردو کا ادیب دہلی وارد ہوتا ہے تو اکثر ان ہی کا مہمان بنتا ہے جہاں انہیں ہوٹل سے بھی زیادہ سہولیات میسر ہوتی ہیں اور اگر بوجوہ وہ کسی اور ادیب یا شاعر کا مہمان ہو جائے تو وہ اسے اپنے گھر یا کسی ہوٹل میں مدعو کر کے اس کے اعزاز میں ایک دعوت کا انعقاد کر دیتے ہیں جس میں متعدد احباب کو بھی شمولیت کا اعزاز بخشا جاتا ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ چونکہ میرا ناؤ نوش سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا نیز مَیں ایسی محفلوں میں کم ہی شریک ہوتا ہوں لہذا مجھے ان میں شامل ہونے کا موقع چند بار ہی ملا ہے اور وہ بھی ان کی گھریلو دعوتوں میں۔ جب کبھی ممتاز شاعر قتیل شفائی، صدیقہ بیگم ایڈیٹر ''ادبِ لطیف'' یا اظہر جاوید ایڈیٹر ماہنامہ ''تخلیق'' دہلی میں قیام کے دوران ان کے گھر پر مہمان رہے یا اُن کی دعوت کی گئی تو

www.taemeernews.com

انہوں نے مجھے بھی اس موقع پر اپنی محفل میں شریک ہونے کا شرف بخشا۔

آج ساقی صاحب اُردو ادب میں ایک لطیفہ باز اور لطیفہ گو کی حیثیت سے اتنی شہرت پا چکے ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسا اُردو جاننے والا ہوگا جو ان کی لطیفوں کے مجموعوں ''ادیبوں کے لطیفے'' اور ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' سے واقف نہ ہو۔ اس دور میں جب کہ عام طور پر اُردو کی کتاب کا ایک ایڈیشن دو ڈھائی سو جلدوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور وہ بھی مارکیٹ میں فروخت کرنے کے بجائے ادیبوں، شاعروں، دوستوں اور رشتہ داروں میں بانٹنے یا دیمک کی نذر کرنے کے لئے، اُن کی کتاب ''ادیبوں کے لطیفے'' کے چار چار ایڈیشن شائع ہونا ان کی مقبولیت و شہرت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ہم سبھی جانتے ہی ہیں کہ ادبی لطائف ساقی صاحب سے پیشتر بھی لکھے جاتے رہے ہیں اور یہ قدیم زمانے سے ہمارے ادب کا ایک حصہ رہے ہیں۔ اردو کے قدیم تذکروں میں بھی کہیں کہیں شعراء کے لطیفے دیکھنے کو ملتے ہیں اور پھر محمد حسین آزاد کے شہرہ آفاق تذکرے ''آبِ حیات'' میں درج لطیفوں کو تو شاید کوئی فراموش نہیں کر پائے گا اور اس کے بعد ہمیں بہت سے ادیبوں کے لطائف سے متعلق مجموعے دیکھنے کو ملے جن میں صفدر مرزا پوری کی مرتب کردہ کتاب ''بزمِ خیال'' منشی دیبی پرشاد کی ''دیوار قہقہہ، منشی انتظام اللہ کی ''لطائف الشعرا''، مرزا محمد عسکری کی ''نوروز'' ایم احمد کی کتاب ''شگوفے''، منشی محمد حسین خان کا 'مجموعۂ ظرافت''، نادم سیتا پوری کی اکبرالہ آبادی کے لطیفے، نریش کمار شاد کے ''سرخ حاشیے'' احمد جمال پاشا کے ''مجاز کے لطیفے''، ممتاز حسین فہیم کے ''گل بوٹے'' خواجہ عبدالغفور کی کتابیں ''شگوفہ زار

www.taemeernews.com

اور ''لالہ زار'') تبسم کے لطیفے،، بیربل اکبر کے لطیفے، ملا دوپیازہ کے لطیفے وغیرہ شامل ہیں مگر ساقی صاحب نے ''ادیبوں کے لطیفے'' اور اس کے بعد اپنی ضخیم کتاب ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' لکھ کر اس میدان میں گزشتہ دَور میں لکھی گئی تمام کتابوں کی شہرت کو ماند کر دیا ہے اور اب اس میں مزید اضافہ کی گنجائش بہت کم باقی رہ گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ساقی صاحب نے بے شمار لطیفے یکجا کر لئے ہیں اور اب انہیں اس کے بجائے سنجیدگی سے انشائیہ اور طنز و مزاح کی جانب توجہ دینی چاہیے کیونکہ اُن کا کشور ناہید کی کتاب پر لکھا تبصرہ نما مضمون ''ایک بدنام عورت کی کتھا'' اور معروف مزاح نگار دلیپ سنگھ سے متعلق انشائیہ ''قہقہوں کا سوداگر'' اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان میں انشائیہ اور طنز و مزاح نگاری کا عنصر بدرجہ اُتم موجود ہے اور اگر وہ اس طرف سنجیدگی سے توجہ دیں تو وہ بہت جلد موجودہ دور کے طنز و مزاح نگاروں فکر تونسوی، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ، بھارت چندکھنہ، نریندر لوتھر کی صف میں شمار ہو سکتے ہیں جو ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے بغیر اس صنف کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ خیر اگر اب وہ کچھ بھی نہ کریں تو بھی ''ادیبوں کے لطیفے'' اور ''خوش کلامیاں قلمکاروں کی'' ایسی کتابوں کی بدولت اُردو ادب میں لطائف لکھنے اور یکجا کرنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہی رہے گا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

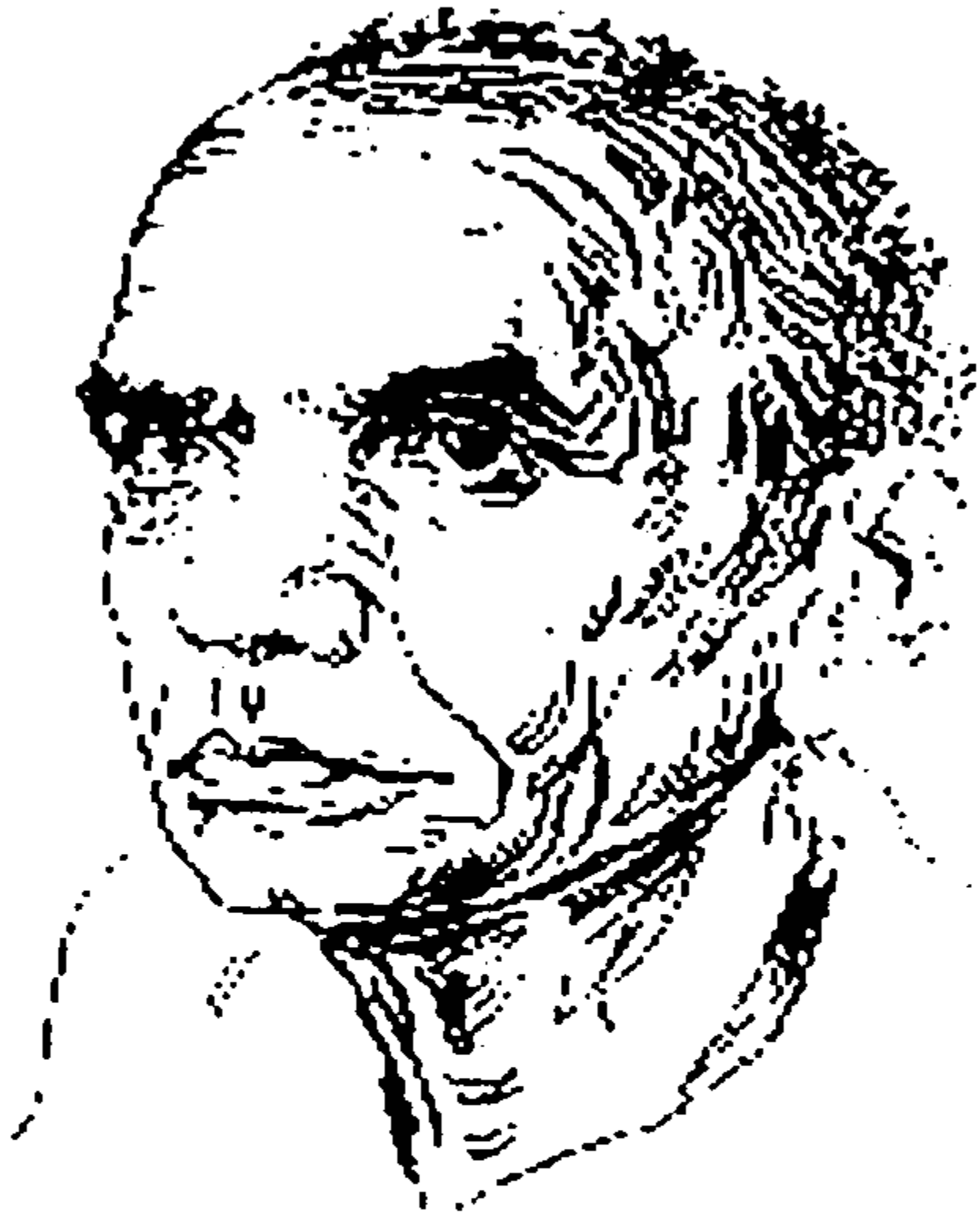

ہنسراج رہبر

پیدائش: ۹ر مارچ ۱۹۱۳ء، ہریادسنگواں، پٹیالہ (پنجاب)

وفات: ۲۳ر جولائی ۱۹۹۴ء، دہلی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

رہبر بے نقاب

ہنسراج رہبر نے صرف افسانے اور ناول ہی نہیں لکھے بلکہ تحقیق اور سیاست پر بھی ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن ان کو زیادہ شہرت اپنی سیاسی اور ادبی تصانیف ''گاندھی بے نقاب''، نہرو بے نقاب'' اور ''غالب بے نقاب (غالب حقیقت کے آئینے میں) سے ہی ملی ہے۔ یہاں تک کہ انہیں عظیم المرتبت شخصیات کو بے نقاب کرنے والا ادیب و نقاد ہی سمجھا جانے لگا ہے۔ اور جب کبھی اُن کی غیر موجودگی میں ادبی محفلوں میں اُن کا ذکر چھڑتا ہے تو اکثر یہ بات موضوعِ سخن بن جاتی ہے کہ جانے اب وہ کس عظیم ہستی کے چہرے کا موکھٹا اُتار کر اُسے بے نقاب کریں گے۔ اور بعض مذاق میں اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ اب رہبر سبھی کو بے نقاب کر چکے ہیں لہذا اب انہیں ''رہبر بے نقاب'' لکھ کر خود اپنے پر عملِ جراحی کرنا چاہیے یا کسی اور ادیب اور نقاد کو آگے بڑھ کر رہبر کو بے نقاب کرنا چاہیے۔

لیکن شاید رہبر کے جارحانہ رویے اور کھری کھری کہنے کی عادت کے پیشِ نظر کسی میں اتنی ہمت و جرأت نہیں کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکے اور رہبر خود شاید اس خیال سے یکسر غافل ہوں۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ مَیں ہی کیوں نہ اس

www.taemeernews.com

واجب الادا فریضے کو انجام دینے کی جرأت کروں۔ مگر بے نقاب تو اُسے کیا جاتا ہے جو اپنے حقیقی چہرے پر طرح طرح کے موکھٹے استعمال کرتا ہو۔ اور رہبر.....؟

رہبر تو موکھٹوں میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ پیٹھ پیچھے کچھ اور سامنے کچھ کہنے والے افراد میں سے نہیں ہیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے منہ پر کہنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اُن کی سچی، تلخ اور ترش باتوں سے کوئی خوش ہوگا یا ناخوش۔ وہ زندگی بھر اپنے نصب العین، اپنے آدرش سے نہیں ہٹے اور انہوں نے اس سلسلے میں کبھی سمجھوتہ بھی نہیں کیا۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح رہی ہے۔ اور چونکہ انہوں نے کبھی کسی نقاب کا استعمال نہیں کیا لہذا اُن میں جرأت اور حوصلہ ہے کہ وہ دوسروں کو بے نقاب کرسکیں اور اُن کی خامیوں اور کمیوں کو عوام کے سامنے لائیں۔ حالانکہ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ کھری اور سچی بات کہنے سے دوست بھی دشمن بن جاتا ہے۔ پھر بھی وہ مصلحت آمیزی سے کام نہیں لیتے اور بغیر لاگ لپیٹ کے اپنی بات منہ پر ہی کہہ دیتے ہیں۔

رہبر اُن محدود سے چند ادیبوں میں سے ہیں جو ادبی اور سیاسی میدان میں چومکھی جنگ لڑتے رہے ہیں۔ وہ ادب میں کھوکھلی نعرہ بازی اور سطحی رومانیت کے مخالف رہے ہیں اور انہوں نے اکثر اس کے بخیئے ادھیڑے ہیں۔ وہ اُن ادیبوں کے بھی سخت مخالف ہیں جو ترقی پسندی، پارٹی یا گروپ بندی وغیرہ کی سیڑھی لگا کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے غلط قسم کے اور نام نہاد انقلابیوں اور ترقی پسند ادیبوں کی کھل کر مخالفت کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے خلاف محاذ آرائی کی گئی اور انہیں بدنام کرنے کے لئے اُن سے متعلق کئی مضحکہ خیز لطیفے گھڑ لئے گئے۔ پھر بھی انہوں نے نام نہاد ترقی پسندوں کی مخالفت نہیں چھوڑی۔ حالانکہ اس کی انہیں بڑی قیمت چکانی پڑی اور جان بوجھ کر اُن کی ادبی خدمات کو نظر انداز کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

www.taemeernews.com

رہبر کہانی میں پریم چند کے مقلد ہیں اور اُن ہی کی طرح انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کی بنیاد مفروضوں پر نہیں بلکہ حقیقت پسندی پر رکھی ہے۔ انہوں نے خیالی یا مصنوعی تصویر کشی سے احتراز کیا ہے اور اپنے ذاتی تجربوں کو ہی کہانی کا روپ دیا ہے۔ گڈولنا'' اس سلسلے میں ایک زندہ مثال ہے۔ اس میں اُن والدین کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جن کے بچے دوسروں کے مقابلے میں دیر سے چلنا شروع کرتے ہیں۔ اور اُن کے دل میں شک اور وہم سا پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اُن کا بچہ لولا تو نہیں۔ اور پھر جب کوئی پڑوسن بچے کو مذاق میں لولا کہتی ہے تو ماں کی مامتا رو اُٹھتی ہے اور کئی بار وہ پڑوسن سے کہتی بھی ہے کہ ''نہیں نہیں۔ میرا لال لولا نہیں۔ بیمار رہا ہے۔ ٹانگیں ذرا کمزور ہیں، جسم میں جان آنے دو، خوب چلے گا.....خوب دوڑے گا،'' حالانکہ ماں کو ایک بڑی وجہ بتانے سے جھجک آتی ہے کہ دوسرا بچہ پیٹ میں آجانے کی وجہ سے اُس کا دودھ سوکھ گیا تھا اور بچہ سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ منی پیدا ہوگئی اور وہ ماں کے دودھ سے محروم ہو گیا تھا۔

اسی طرح ''جھوٹ سچ'' میں انہوں نے ایک فنکار کی ذہنی کیفیت اور اس کے ردِ عمل کی تصویر کشی کی ہے جو اپنی محبوبہ نشا سے دُور رہ کر سچائی کو مجسم کرنا چاہتا ہے۔ مگر ایسا کر نہیں پاتا۔ کیونکہ صداقت خیال اور مادی حالات کے امتزاج کا نام ہے اور مادی حالات اور خیالات بدلتے رہتے ہیں لہذا صداقت بھی بدلتی رہتی ہے۔

''سالگرہ'' میں ایک ایسے ادیب کی کہانی بیان کی گئی ہے جو چالیس سال کا ہونے پر اپنی نئی زندگی شروع کرنے کی سوچتا ہے اور کھری اور کڑوی بات کہنے کو تلا نجلی دینا چاہتا ہے جس سے اس کا اکثر لوگوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور چند گھنٹوں بعد ہی کھری سچی لیکن کڑوی لگنے والی بات کہنے کے اپنے پرانے وطیرے کو اپنا لیتا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی شخص آسانی سے اپنی فطرت اور مزاج میں تبدیلی نہیں لا سکتا

www.taemeernews.com

اور یہ کہ سچی اور کھری بات کہنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے، چاہے اس سے کوئی ناراض ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اُن کی کہانی ''زخم'' جو لاہور کے معروف ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کے جون ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اُس کا پس منظر بھی اُن کے لاہور کے دوستوں کیول کرشن اور اوتار کرشن کا غیر دوستانہ اور ہتک آمیز رویہ تھا جس نے انہیں ایسا زخم لگایا جو زندگی بھر مندمل نہ ہو سکا۔ اُن کے یہ دوست یوں تو انہیں کمرے میں بُلا کر اُن کی شعر و شاعری سے محظوظ ہوتے تھے مگر اُن کے معمولی کھدر کے کپڑوں کی وجہ سے انہیں باہر اپنے ہمراہ لے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے جب انہیں راوی پر سیر کی غرض سے جانا تھا تو وقت سے پہلے ہی کمرے کو تالہ لگا کر چلے گئے تھے۔ اسی طرح کچھ دنوں بعد اوتار کرشن کو امتحان کے لئے انبالہ جانا تھا تو بھی بہانے سے انہیں اسٹیشن تک ساتھ جانے سے روکا گیا اور جب وہ ان کی بات نہ سمجھ کر الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن جانے کی غرض سے تانگے پر بیٹھنے لگے تو اوتار کرشن نے اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پھر ملیں گے، بائے بائے'' اتنا کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ گئے اور انہیں تنہا چھوڑ کر اسٹیشن چلے گئے۔

اس واقعہ سے انہیں بے حد تکلیف ہوئی اور اس کے ردعمل میں انہوں نے کہانی ''زخم'' پیش کی۔ حقیقی واقعہ پر مبنی اس کہانی کے ہیرو نارائن کی دلی کیفیت کو انہوں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

> ''نارائن سنیما دیکھنے چلا تو گیا لیکن گھر سے جو شوق دل میں لے کر چلا تھا، وہ سرد پڑ چکا تھا۔ فلم چل رہی تھی اور نارائن کا خیال کہیں اور گھوم رہا تھا۔''

اسی قسم کے ایک اور واقعہ کی یاد اُسے ستا رہی تھی۔ ایک دن امیش نے اُسے راوی پر کشتی کی سیر کے لئے مدعو کیا لیکن جب وہ

www.taemeernews.com

مقررہ وقت سے پہلے ہی اس کے مکان پر پہنچا تو وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔ وہ سب جا چکے تھے۔ اُس کے دل پر چوٹ تو لگی مگر اُس نے غلط فہمی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ آج وہی بھولی بات من میں کھٹکنے لگی۔ سب ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر مقررہ وقت سے پہلے چلے گئے تھے کیونکہ وہ اسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا؟ وہ تو سب ہنس مکھ، ملنسار اور پُر خلوص دوست تھے۔ اُن سے ہرگز ایسی بات کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر چھوڑ دینا ہی مقصود تھا تو بُلانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں پہنچ کر اس کا دماغ کام نہیں دیتا تھا۔ آخر اس تلخی کو بھلانے دینے کے لئے اُس نے فلم میں جی لگانے کی کوشش کی۔ کہانی کا ہیرو دیو داس غم کو بھلانے کے لئے بار بار شراب پیتا تھا اور نارائن سوچتا تھا کہ جو غم آدمی کی روح میں سرایت کر چکا ہو کیا کبھی اُسے بھلایا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب کہانی کے آخر میں یہ ملا تھا کہ جیتے جی ایسا ہونا ناممکن ہے۔''

خود رہبر صاحب کے الفاظ میں:

''زخم میرا دوسرا یا تیسرا افسانہ ہے۔ اُس وقت میں ترقی پسندی اور افسانہ نگاری کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ زندگی کے ایک سچے واقعہ کو لے کر افسانہ کے طور پر پیش کر دیا۔ اس واقعہ سے میری روح پر جو زخم آیا تھا، وہ اب تک رِس رہا ہے اور اس سماجی بربریت کے خلاف روح میں جو احتجاج پیدا ہوا تھا وہ اس افسانہ میں موجود ہے۔ اور بربریت اصلاح طلب ہے۔

مَیں نے بہت چاہا کہ یہ زخم بھر جائے لیکن بھرا نہیں..... ذرا انگور آتا ہے کہ ایک نہ ایک نئی زد آن پڑتی ہے۔ جو اسے کرید دیتی ہے۔ مَیں

www.taemeernews.com

بلبلا اُٹھتا ہوں۔ کرید نے والے یہ تلخی تو دیکھ لیتے ہیں مگر اپنے ناخن نہیں دیکھتے۔ تلخی میرے کردار اور تحریر کا حصہ بن چکی ہے۔''

''لاکٹ'' ایک بہت سیدھی سادی لیکن دل پذیر کہانی ہے۔ جو بیوی کے اعلیٰ کردار کا امٹ نشان چھوڑتی ہے۔ یہ ایک ایسے میاں بیوی کی کہانی ہے جو زندگی میں بہت سی ضروریاتِ زندگی کے لئے ترستے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ایمانداری اور اعلیٰ کریکٹر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ بیوی کو سونے کا لاکٹ پہننے کی بڑی خواہش ہے لیکن وہ بنوانے سے معذور ہیں۔ ایک بار جب انہوں نے مکان بدلا تو مکان میں پرانے کرایہ دار کی بیوی کا لاکٹ مل گیا۔ پتی کے دل میں چور آ گھستا ہے کہ چلو مفت میں مل گیا لیکن بیوی کے دل میں اُسے رکھنے کا ذرا بھی خیال پیدا نہیں ہوتا وہ فوراً مالک مکان کی بیوی کو آواز دے کر بتاتی ہے کہ پچھلی کرائے دارن کا لاکٹ رہ گیا ہے۔ اور اس وقت شوہر کو اپنی عورت کا چھوٹا قد بہت اُونچا دکھائی دینے لگتا ہے اور اپنے آپ پر اسے ندامت محسوس ہوتی ہے۔

رہبر کا شمار گنتی کے چند ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جو ہندی اور اُردو دونوں میں باقاعدگی سے لکھتے رہے ہیں۔ صرف ابتدائی برسوں ہی میں انہوں نے صرف اُردو میں لکھا ہے لیکن حصولِ آزادی کے بعد وہ اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھنے لگے۔ اور اب ان کی ادبی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کے مقابلے میں اُردو میں ان کی بہت کم کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اُردو میں اُن کی بمشکل ایک درجن کے قریب کتابیں شائع ہوئی ہیں جبکہ ہندی میں اُن کی کتابوں کی تعداد پچاس سے بھی زائد ہے۔ ہندی میں اُن کے افسانوں کے پانچ مجموعے، چودہ ناول، اور تحقیق وتنقید پر ایک درجن سے زائد کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں جن میں پریم چند جیون کلا اور کری تتو، پرگتی واد: پُنر مولیانکن، غالب بے نقاب، تلک سے آج تک، یودھا سنیاسی، نہرو بے نقاب، گاندھی بے نقاب، بھگت سنگھ ایک جیونی، ماؤ زے

www.taemeernews.com

تنگ: ایک جیونی، ہوچی منہ اور خود ان کی سوانح عمری ''میرے سات جنم'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جبکہ اُردو میں اُن کے افسانوں کے صرف تین مجموعے ''نیا اُفق''، ''ہم لوگ'' اور ''اب اور تب''، پانچ ناول ''تارو''، ''پریڈ گراؤنڈ''، ''آنکے بانکے''، ''بات کی بات'' اور ''پَر کٹی تتلی''، اور تحقیق وتنقید کی تین کتابیں ''پریم چند: ترقی پسند ادب: ایک جائزہ'' اور ''غالب حقیقت کے آئینے میں'' ہی شائع ہوئی ہیں۔ اُردو میں کم لکھنے کی اہم وجہ انہیں نظر انداز کیا جانا اور ان کے تئیں بے التفاتی برتنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی میں بھی اُن کی زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی لیکن اُردو اکادمیوں اور اداروں نے ان کی بالکل پذیرائی نہیں کی۔ اور انہیں کسی انعام واعزاز سے نہیں نوازا جبکہ وہ اُردو کے بزرگ ترین اور اہم افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں سے ہیں۔

رہبر کی زندگی سے روشناس جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ اپنی اور اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور اخبار بیچ کر اور ٹیوشن پڑھا پڑھا کر انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی، جنگِ آزادی میں وہ کئی بار جیل گئے اور چونکہ وہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو دیش کا آزاد ہونا اقتدار کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا مانتے ہیں اس لئے آج تک وہ سرکار کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔ اور آزادی کے بعد بھی وہ کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ جہاں کسی سیاسی پارٹی میں عیب دکھائی دیا، انہوں نے اُسے تلانجلی دے دی۔ ابتدا میں وہ کانگریسی تھے مگر بعد ازاں کمیونسٹ بن گئے اور جب کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم ہوئی تو وہ مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اور آخر کار چارو مجمدار کی نکسل وادی پارٹی میں چلے گئے۔ اس کی جھلکیاں ان کی تخلیقات میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں کہیں جیل میں مجاہدینِ آزادی کی زندگی بیان کی گئی ہے تو کہیں مزدوروں کی تنظیموں کا ذکر ملتا ہے۔، کہیں غیر ملکی حکمرانوں کے جبر واستبداد پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں تو کہیں بے روزگاری، بھکمری، ناخواندگی، استحصال اور طبقاتی جدو جہد پر قلم اُٹھایا گیا

www.taemeernews.com

ہے۔کہیں بگلے بھگت قسم کے دیش بھگتوں کا بھانڈہ پھوڑا گیا ہے تو کہیں سماجی بدعتوں،توہمات اور نابرابری کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔کہیں ماں کی ممتا کو بڑے دلگداز انداز میں پیش کیا گیا ہے تو کہیں لڑکیوں کی تعلیم و ملازمت کے مسئلے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت بیانی سے انحراف کر رہے ہیں۔

ان کہانیوں میں جگہ جگہ اُن کی زندگی کے واقعات نیز اُن کے اِردگرد کے ماحول کی جھلکیاں ملتی ہیں۔بہت سے افسانوں کے کردار تو ان سے ملتے جلتے ہیں،ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اُن میں اپنی ہی کردار نگاری کرتے رہے ہیں۔نارائن کا کردار جو اُن کی کئی کہانیوں اور ناول ''کنکر'' میں پیش کیا گیا ہے،غالباً اُن کا اپنا ہی کردار ہے۔مثلاً ''سالگرہ''میں وہ نارائن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ عام زندگی میں کھری اور کڑوی بات کہنے کا عادی تھا اس لئے اُس کا اکثر لوگوں سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔'' اور ہم سب جانتے ہیں کہ کھری اور کڑوی بات کہنا رہبر صاحب کی ہی فطرت ہے۔اسی طرح نارائن کا جنم دن ۹ مارچ ہے جو کہ رہبر صاحب کا ہی جنم دن ہے۔یہی نہیں انہوں نے اپنے جیل کے تجربات اور وہاں کے ساتھیوں کے حالات و کردار کو بھی اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔

کہانی ''راجارام'' میں انہوں نے جیل میں قید مجاہدین آزادی کے حالات بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں۔یہ کہانی ۱۹۴۳ء کے قریب لکھی گئی تھی لیکن اس میں کہی گئی بہت سی باتیں سچ ثابت ہوئی ہیں۔جیسے اس میں ایک جگہ ایک کردار کی زبانی اُنہوں نے یہ الفاظ کہلوائے تھے،حالانکہ اُس وقت کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات میں اتنی کشیدگی آجائے گی۔

''کبھی وہ زمانہ تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں باہمی شادیاں ہوتی تھیں۔ اب سکھ کہتے ہیں۔ہندو سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔دس سال بعد ہندو اور سکھ بھی ایک

www.taemeernews.com

دوسرے کو مسلمانوں کی طرح اچھوت سمجھنے لگیں گے۔''

اسی طرح ذات پات کے مسئلے پر بھی انہوں نے اپنے کئی کرداروں کے ذریعہ خامہ فرسائی کی ہے۔ جیسے ''ذات اور کائنات'' میں گوردھن شرما اس افسوس ناک صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''ذات پات کا اعتراض کیا کوئی کم مسئلہ ہے؟ ہم تو مٹھی بھر لوگ بدل گئے ہیں۔ ہمارے لئے شرما اور متل بے معنی الفاظ ہیں یا یوں سمجھ لو کہ نام کا حصہ ہیں لیکن اور لوگ تو نہیں بدلے۔ یہ سماج جسے بدلنے کے لئے ہم نے اتنی جدو جہد کی اور نہ جانے کتنی مصیبتیں برداشت کیں، آزادی کے سولہ سترہ سال بعد بھی نہیں بدلا۔ بدستور اپنا پھن پھیلائے ہوئے ہے۔ لوگ نہایت بے ہودہ رسم و رواج اور توہمات کے بندھن میں جکڑے ہوئے سسک رہے ہیں، مگر ان بندھنوں کو توڑنے کی ہمت نہیں..... جب ہم پڑھے لکھے اور مہذب کہلانے والوں کا یہ حال ہے تو ان پڑھ دیہاتیوں کی تو بات ہی جانے دیجیے متل صاحب! اتنی زندگی گزار کر مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم مٹھی بھر آدمی جنہوں نے صحیح طور پر سیاسی زندگی بسر کی ہے، ایک بہت بڑی تبدیلی کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور دیکھتے ہی رہے لیکن جب کوئی عملی قدم اُٹھانا پڑتا ہے اور کوئی معمولی سا بھی حقیقی مسئلہ پیش آتا ہے تو یہ خواب منتشر ہو جاتا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی کے رسالہ ''فنون'' کے ۱۹۹۱ء کے سالنامہ میں شائع اُن کی کہانی ''وہ ناچیز نہیں تھا'' کا ہیرو جیون شیخ بھی کوئی فرضی شخصیت نہیں بلکہ اُردو کا ترقی پسند شاعر اور ادیب تاجور سامری ہے جو زندگی بھر انقلاب اور خوشحال دنیا کے خواب دیکھتا رہا اور پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس مفلسی کے عالم میں زندگی کی

www.taemeernews.com

گاڑی گھسیٹنے کے باوجود بھی ملک میں اشتراکی نظام کے تحت انقلاب لانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ اُس نے اُردو ادب کی خدمت کے لئے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا پرچہ نکالنے کے لئے وہ چندہ ہی اکٹھا نہیں کرتا تھا بلکہ بعض اوقات اس کے لئے پیسہ بچانے کے لئے فاقہ بھی کر لیتا تھا۔ لیکن جس کی موت پر نہ تو کوئی تعزیتی جلسہ کیا گیا اور نہ ہی کسی رسالے کا کوئی گوشہ وقف کیا گیا کیونکہ وہ ایک غریب اور مفلس ادیب تھا۔ حقیقت پر مبنی یہ افسانہ اُردو کے ایک مخلص ادیب کو خراجِ عقیدت ہی نہیں بلکہ کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

فرقہ واریت سے متعلق ان کی کہانی ''تب اور اب'' کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جسے ان کی بہترین کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے اور جس کی بہت سے ناقدین نے تعریف وتوصیف کی ہے۔

گورہبر کی شناخت ایک فکشن نگار اور نقاد کی حیثیت سے زیادہ ہے مگر انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی تھی اور وہ مشہور شاعر عرش ملسیانی کے شاگرد تھے۔ ابتدائی دنوں میں اُن کا کچھ کلام مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوتا رہا لیکن بعد ازاں انہوں نے شاعری کے بجائے تنقید و فکشن پر ہی توجہ دی۔ تاہم وہ کبھی کبھار شوقیہ شاعری کر لیا کرتے تھے اور ان کی شاعری کا ایک انتخاب ''احساس'' منظرِ عام پر بھی آچکا ہے۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

زمانے کی ہوائے سرفروشی خوں کی پیاسی ہے
مجھے رغبت سی ہوتی جا رہی ہے دستِ قاتل سے

مرہم کی جستجو نہیں رہبر کو دوستو
زخموں کو ناخنوں سے سنوارا کبھی کبھی

www.taemeernews.com

میرے قلبِ حزیں کا یہ سکوں طوفاں بداماں ہے
میری خاموشیوں کو بے زبانی کون کہتا ہے

دنیا میں وہ رہتا ہے اور خُلد کی کہتا ہے
واعظ کی بتا رہبرؔ! کیا بات کوئی مانے

عدم کی بات کچھ سُنتے کسی سے
کوئی تو لوٹ کر آتا وہاں سے

یہ چہرے ہیں انسانوں کے، کچھ ارتھ ہے اس خاموشی کا
جب سُننے والے بہرے ہوں، بیکار کا شکوہ کون کرے

لنگر میں کیسے ڈال دوں طوفاں کے خوف سے
کشتی جہاں لگے گی وہ ساحل ہی اور ہے

پیڑ کے پتے گننے والو تم رہبرؔ کو کیا جانو
کپڑا لتہ ٹھیک نہ ہو پر بات تو اس کی بھاری ہے

رہبرؔ دوسرے ادیبوں کی طرح نہ تو زبان دانی کے جوہر دکھاتے ہیں اور نہ ہی لچھے دار فقروں اور لفاظی سے قاری کو مسحور کرتے ہیں۔ وہ جس طرح خود سیدھے سادے ہیں، اسی طرح سیدھے سادے الفاظ میں عام بول چال کی زبان میں اپنی تخلیقات کا تانا بانا بنتے ہیں۔ چونکہ وہ ٹھہراؤ اور سمجھوتے کے قائل نہیں اور اپنے رہبر بھی خود آپ ہی ہیں اس لئے بغیر کسی کی پروا کئے مسلسل لکھتے جا رہے ہیں۔ کہیں رُکنے

www.taemeernews.com

کا نام نہیں لے رہے۔ اُن میں پائی جانے والی تلخی کو دیکھ کر مشہور شاعر یاسؔ یگانہ کی یاد آجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یاسؔ یگانہ کی طرح ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اُن کے فن کو نظر انداز کئے جانے کے رویہ سے اُن کی تلخی میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ اور انہیں حاشیے پر دھکیلنے کی کوشش نے اُن میں ایسی آگ بھر دی ہے جس نے متعدد شخصیات کو بُری طرح جھلسا دیا ہے اور اپنے آہنی قلم سے انہوں نے کئی بڑے بڑے بُت توڑ دئے ہیں۔ اُن کی شدت اور جارحانہ رویے کو دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی غالبؔ کی طرح کہہ رہے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

☆☆☆

www.taemeernews.com

نند کشور وکرم

پیدائش: ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء راولپنڈی (پاکستان)

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

بقلم خود

(غبارِ کارواں)

میرے کاروانِ حیات کو شاہرہِ وقت پر چلتے ہوئے بیاسی سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور اسے اپنے آخری پڑاؤ تک پہنچنے میں عمر کے حساب سے کم ہی وقت رہ گیا ہے اور یہ شمع زندگی کبھی بھی بجھ سکتی ہے۔ لیکن کب اور کس دن، کوئی پیر پیغمبر، سنت مہاتما یا نجومی اور جیوتشی بھی یہ بات نہیں بتا سکتا۔ کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہیں کہ آخری منزل پر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا اور کب وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر جائے۔ اس لئے بقول فیضؔ لدھیانوی مرحوم مَیں بھی اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ:

میں ہوں ناواقف مگر ہر سال آتی ہے ضرور
فیضؔ جس کو کل کہیں گے میری تاریخ وفات

(فیض لدھیانوی)

عام طور پر یہ 'آخری وقت' زیادہ تر لوگوں پر بہت بھاری گزرتا ہے، سوائے اُن حضرات کے جو آخری عمر تک سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور چلتے پھرتے یا رات کو سوتے

www.taemeernews.com

سوتے اچانک موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بڑا خوش نصیب تھا کہ کسی کو تکلیف دیئے بغیر بڑی پُرسکون حالت میں آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔

مَیں اکثر عالمِ تخیل میں اپنے ماضی کی گلیوں اور گلیاروں میں گھوم کر اُن گزرے ہوئے واقعات و حادثات کو یاد کرتا ہوں جن کی یادوں کے نقوش وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنے دھندلے اور ماند پڑ گئے ہیں کہ ذہن پر انتہائی زور ڈالنے پر بھی اکثر یاد ہی نہیں پڑتے۔ ہاں کچھ یادیں ایسی ہیں کہ وہ دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گئی ہیں اور انہیں کبھی فراموش نہیں کر پایا۔ اور جب بھی تنہائی میں ہوتا ہوں تو کئی سانحات و واقعات سنیما کی تصاویر کی مانند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔

تقسیم سے پیشتر ہمارا آبائی خاندان مغربی پنجاب کے ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں اراضی چھپراں میں سکونت پذیر تھا جو تقسیم ملک کے بعد پاکستان کا حصہ بن گیا اور ہمیں پنجاب کے تبادلۂ آبادی کے تحت مغربی پنجاب سے نقل مکانی کر کے مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ میں آ کر آباد ہونا پڑا جو بعد ازاں ہریانہ کا حصہ بن گیا۔

میرے آباواجداد گزشتہ نو دس پشتوں سے اپنے آبائی گاؤں اراضی چھپراں میں رہ رہے تھے۔ اس سے پیشتر وہ کہاں رہتے تھے، وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر خیالِ اغلب ہے کہ وہ ضلع گورداسپور کے قصبہ کنجروڑ دتاں سے نقلِ مکانی کر کے یہاں آئے ہوں گے کیونکہ زیادہ تر دت کنبے کنجروڑ دتاں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارے خاندان کے زیادہ تر افراد اس گاؤں میں کوئی اڑھائی تین سو سال سے سکونت پذیر تھے لیکن ہمارا کنبہ دادا اور والد کی ملازمت کی وجہ سے راولپنڈی شہر میں قیام پذیر تھا۔ لہذا کبھی کبھار فصلوں کی تعطیلات یا کسی شادی بیاہ کے موقع پر وہاں

www.taemeernews.com

جانے کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ان لوگوں کا انحصار زمین کی کاشتکاری اور پولیس اور فوج کی ملازمت پر تھا۔مگر نسل در نسل کنبوں میں زمین تقسیم ہوتے ہوتے بہت کم رہ گئی تھی۔ اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو کسی کے پاس پانچ سات بیگھے زمین تھی تو کسی کے پاس پندرہ بیس بیگھے ۔اور اگر دو تین نسلیں اور گزرتیں تو بڑھتی ہوئی آبادی کے نتیجے میں ہر ایک کے حصے میں شاید دو دو تین تین بیگھے زمین ہی رہ جاتی۔

شاید یہی وجہ تھی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی راج قائم ہو جانے کے بعد جب شہروں اور چھاونیوں کی بھرمار ہونے کے ساتھ ساتھ صنعتی اداروں اور فیکٹریوں کے قیام نے لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے تو زمینداروں اور کسانوں کے بیٹے فوج، پولیس اور صنعتی اداروں اور سول محکموں میں ملازمت کی غرض سے شہروں کی جانب رجوع کرنے لگے۔اسی صورت حال کے پیش نظر میرے دادا (گنڈا مل دت) بھی انیسویں صدی کے اواخر میں روزگار کے سلسلے میں اپنے آبائی گاؤں سے نقل مکانی کر کے پنڈی آ گئے اور صدر کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔لیکن تقریباً نصف صدی تک وہاں مقیم رہنے کے باوجود بھی وہ کرائے کے مکان میں ہی رہتے رہے۔ہوسکتا ہے کہ قلیل آمدنی میں وہ بڑے کنبے کی پرورش کی وجہ سے مکان خریدنے کے لئے روپیہ نہ جٹا پائے ہوں یا پھر ملازمت کے بعد واپس اپنے گاؤں جا کر بقیہ زندگی آرام وسکون سے گزارنے کی خواہش کے زیر اثر اُنہوں نے سوچا ہی نہ ہو۔میرا خیال ہے کہ موخر الذکر وجہ ہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میرے دادا واپس گاؤں چلے گئے تھے اور وہیں اپریل ۱۹۴۷ء میں اُن کی وفات ہوگئی تھی۔

میرے دادا کوئی پون صدی تک راولپنڈی شہر میں مقیم رہے اور وہیں میرے والد اور ان کی دیگر تین بھائیوں کی پرورش و پرداخت ہوئی۔میرے والد (رام لال دت) نے ۱۹۲۱ء میں سناتن دھرم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور جلد ہی

www.taemeernews.com

ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور راولپنڈی کی مختلف تحصیلوں مری، گوجر خان اور کہوٹہ میں متعین رہے۔ پھر ۱۹۴۷ء میں انبالہ شہر آ گئے اور وہیں سے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میرے پاس دہلی آ گئے اور یہیں ۴ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اُن کی وفات ہوگئی۔ (عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۰۴ء میں اُن کی پیدائش بھی ۴ر اکتوبر کو ہی ہوئی تھی)

ہم لوگ موہیال برہمن ہیں جو سات ذاتوں دت، بالی، چھبر۔ موہن وید بھمبوال اور لو پر مشتمل ہیں اور تقسیم ملک سے پیشتر ہم لوگ زیادہ تر اپنی برہمن برادری میں ہی شادی کیا کرتے تھے لیکن اب آزادی کے بعد جو سماجی تبدیلیاں آئی اس کے پیش نظر اب یہ رواج بتدریج ختم ہوتا جا رہا ہے اور ذات برادری سے باہر شادیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا خاندان موہیالوں کی اول الذکر ذات ''دت'' سے تعلق رکھتا ہے جنہیں عام طور پر حسینی برہمن کہا جاتا ہے اور جن کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے جنگِ کربلا میں حضرت حسین کا ساتھ دیا تھا اور ان کا سر یزید کی فوج سے واپس لائے تھے۔ معلوم نہیں اس میں کتنی صداقت ہے لیکن ہم لوگوں کو اس بات پر ہمیشہ بڑا فخر بھی رہا ہے۔

ہمارے 'دت' خاندان کو بھی دیگر ذات برادریوں کی طرح اپنی خاندانی روایات پر بڑا ناز رہا ہے اور وہ ڈینگیں مارنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'دت' ہندی لفظ 'داتا' سے بنا ہے جو سنسکرت کے لفظ آدتیہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کے معنی ہیں آدتی نامی دیوتا کا بیٹا اور کرۂ شمسی۔ اُن کے عقیدہ کے مطابق وہ مہابھارت کے نامور سپہ سالار درون آچاریہ کی اولاد سے ہیں اور اُن کی اولاد میں سے کئی حضرات نے عرب، افغانستان اور کشمیر پر حکمرانی کی تھی۔

ایک روایت کے مطابق 'دت' جہلم کے راجہ پورس کے 'دت' نامی اس سفیر سے تعلق رکھتے تھے جو سکندر اعظم کی واپسی کے دوران اُس کی رہنمائی کے لئے اُس کے

www.taemeernews.com

ہمراہ گیا تھا اور جب بابل کے مقام پر سکندر کی موت واقع ہوگئی تو وہ اپنے ساتھیوں اور سپاہیوں کے ساتھ عرب دیش میں ہریا بندر کے مقام پر آباد ہوگیا۔ بعد ازاں آبادی میں اضافہ ہونے پر وہ وہاں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمران بن گئے اور جب جنگِ کربلا میں یزید کے خوف سے کوئی بھی حضرت حسینؓ کی مدد کے لئے نہیں آیا تو دت خاندان کا 'راہب' اُن کی مدد کے لئے میدانِ جنگ میں کود پڑا اور اُس تاریخی جنگ میں اُس نے اپنے ساتوں بیٹوں سہس رائے، ہرجس رائے، پُرو، شیر خان، رائے پن، رام سنگھ، دھرو اور مورو کو حضرت حسینؓ پر قربان کر دیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے حضرت حسینؓ کے سر کو یزید سے حاصل کرنے میں مدد بہم پہنچائی۔ روایت ہے کہ حضرت حسینؓ کا ساتھ دینے کی وجہ سے سنی حضرات مذکورہ 'راہب' کے خلاف ہو گئے اور چونکہ وہ پہلے ہی بیٹوں کی جنگ میں ہلاکت کی وجہ سے رنجیدہ و پریشان تھا لہٰذا وہ اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ عرب دیش سے ہجرت کر کے ایران اور ترکستان کے راستے افغانستان چلا گیا۔ بعد میں وہ لوگ ہندوستان میں آ کر بس گئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت حسین کے پیروکاروں نے اُن کی قربانی کو فراموش نہیں کیا اور انہیں حسینی برادران کے نام سے موسوم کیا نیز یہ کہ پنجابی شاعر احمد کے جنگ نامہ کے صفحہ ۱۷۵ اور ۱۷۶ پر حسینی برہمنوں کی تعریف کرتے ہوئے شیعہ حضرات کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی ہر عبادت میں راہب کا نام لیں۔

اسی طرح کے واقعات کا تذکرہ ممتاز و نامور مؤرخ حافظ محمود شیرانی نے اپنی معروف تحقیقی کتاب 'پنجاب میں اُردو' میں شاعر 'نامدار خاں دت' کے سوانحی کوائف میں بھی ادیب و صحافی گوری شنکر ساگر کی تصنیف ''گلشن موہیالی'' سے بطورِ حوالہ کیا ہے کہ.....

''دت سلطان، آدھے ہندو، آدھے مسلمان''

www.taemeernews.com

حافظ محمود شیرانی سے پیشتر ۱۹۱۱ء میں ایک انگریز تاریخ داں پی.ٹی۔رسل، سٹریسی (P.T. Russel) نے بھی اپنی تصنیف 'دی ہسٹری آف دی موہیالز' (History of the Mohyals) میں بھی اس طرح کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ تاریخی اعتبار سے ان روایات میں کتنی صداقت ہے۔ ہاں جہاں تک میرا خیال ہے یہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایات ہیں اور ان میں بہت سی روایات تحقیق طلب ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ برصغیر کے بٹوارے سے پیشتر پنجاب، صوبہ سرحد اور افغانستان میں موہیال برادری بڑی تعداد میں آباد تھی اور اُن کی خاصیت یہ تھی کہ براہمن ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ دان لینے کو برا اور معیوب سمجھتے تھے۔ نیز عام برہمنوں کے برعکس یہ لوگ شراب و کباب کے بھی رسیا تھے اور عام طور پر ان کا پیشہ کاشتکاری یا پولس اور فوج میں ملازمت تھا۔

میری پیدائش ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو راولپنڈی شہر میں بھابڑا بازار اور صرافہ بازار کے عقب میں واقع محلّہ نہال سنگھ چھاچھی میں ہوئی۔ جہاں ہمارا کنبہ تقسیم ملک تک سکونت پذیر رہا۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے میری پیدائش ۱۷ر ستمبر سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ ہاں مَیں ماں کے بطن سے ۱۷ر ستمبر کو اس دنیائے رنگ و بو میں آیا تھا۔ مَیں ۱۷ر ستمبر سے بہت پہلے اپنی ماں کے بطن میں سانسیں لے رہا تھا۔ مجھ میں ہوش و شعور پیدا ہو چکا تھا اور بطنِ مادر کی قید اور گھٹن سے نجات پانے کے لیے چھٹپٹا تا رہا تھا اور آخر بڑی جدوجہد کے بعد مجھے اُس تنگ و تاریک کوٹھڑی سے ۱۷ر ستمبر کو چھٹکارا ملا تھا۔

مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں ۱۷ر ستمبر کو پیدا ہوا یا ۲۷ر ستمبر کو؟ کیونکہ سبھی دن ایک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ کوئی دن منحوس و نحس ہوتا ہے نہ ہی مبارک و مقدس۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ثانیہ میں پیدا ہونے والے ہزاروں بچوں کی قسمت ایک ہی طرح کی ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ مفلس و نادار ہوتے ہیں تو کچھ امیر و رئیس۔ کوئی اندھا ہوتا ہے تو کوئی لنگڑا و اپاہج۔ کوئی بھیک مانگتا ہے اور کوئی رئیسانہ

www.taemeernews.com

ٹھاٹ سے عیش وآرام کی زندگی گزارتا ہے۔

بہرحال میری ماں اور گھر والوں کا عقیدہ تھا کہ میں بہت ہی مبارک دن پیدا ہوا تھا کیونکہ اس دن انت چودش تھی اور شکلا پکش کی چتر دشی۔ جب انت یعنی وشنو کی پوجا کی جاتی ہے اور جو وشنومت کا سب سے بڑا تہوار مانا جاتا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور میرا تجربہ ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی یہ کوئی غیر معمولی بات ہے کیونکہ ہر روز دنیا میں لاکھوں افراد پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ البتہ میری ولادت میرے کنبے کے لیے بہت خوشی کا موقع تھا کیونکہ ہمارے سماج میں لڑکے کی پیدائش پر سبھی یوں خوش ہوتے ہیں جیسے قدرت نے انہیں کوئی بیش بہا خزانہ بھیج دیا ہو یا کثیر الرقم ہنڈی۔ اور بیٹی کے جنم پر یوں رنجیدہ و مایوس ہو جاتے ہیں جیسے اُن پر مصیبت کا کوئی کوہِ گراں ٹوٹ پڑا ہو۔ حالانکہ لڑکوں کی نسبت لڑکیاں ماں باپ کی زیادہ خدمت گزار ہوتی ہیں اور لڑکوں سے والدین کو اکثر نا اُمیدی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

میرے والد کے تبادلے اور خانگی حالات کی وجہ سے میری تعلیم ایک جگہ نہ ہوسکی۔ پہلی جماعت مَیں نے سناتن دھرم پرائمری اسکول راولپنڈی شہر سے ہندی میں کی کہ میرے والد کا تبادلہ گوجرخان ہوگیا اور مجھے از سرنو سناتن دھرم مڈل اسکول گوجرخان میں پہلی جماعت میں داخلہ لینا پڑا کیونکہ وہاں ہندی کے بجائے اُردو میڈیم میں پڑھایا جاتا تھا۔ جب دوسری جماعت پاس کی تو والد کا تبادلہ کہوٹہ ہوگیا جو اب پاکستان کا معروف ایٹمی مرکز ہے۔ پھر اسی دوران میری والدہ بیمار پڑ گئیں اور مجھے مجبوراً اپنے ننیہال آکر تیسری جماعت میں داخلہ لینا پڑا۔ اسی جگہ سے مَیں نے ۱۹۴۵ء میں ورنیکولر فائنل کا امتحان پاس کیا اور پھر راولپنڈی آکر سناتن دھرم ہائی اسکول میں نویں جماعت میں داخل ہوگیا۔ دسویں جماعت کے امتحان کے دوران ہی فسادات شروع ہوگئے اور نقلِ مکانی کر کے ہمارے خاندان کے افراد انبالہ آگئے اور

www.taemeernews.com

ایف اے کے لئے میں نے ڈی اے کالج انبالہ شہر میں داخلہ لیا۔ بعد ازاں ایم اے فارسی پنجاب یونیورسٹی کے کیمپ کالج نئی دہلی سے اور ایم اے اُردو دہلی یونیورسٹی سے کی۔

ہمارا کنبہ سناتن دھرمی خیالات وعقائد میں یقین رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے ابتدا میں مَیں بھی ان ہی خیالات کا پیروکار بن گیا۔ مگر جوں جوں ہوش سنبھالا سناتن دھرم کے گرنتھوں میں دیوی دیوتاؤں سے متعلق بیان کردہ مافوق الفطرت کارناموں اور معجزوں پر شک وشبہ پیدا ہونے لگا۔ لیکن جب میری ماں تپ دق ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئیں اور تمام دیوی دیوتاؤں کی عبادت' جنتر منتر' تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں کے باوجود وہ موت سے نہ بچ سکیں تو میرا ان سے اعتقاد متزلزل ہوگیا اور اس کے بعد جب برِصغیر کی تقسیم میں ہزاروں بے گناہ ہندو مسلمان مارے گئے اور کوئی کراماتی پیر' فقیر' ولی' سادھوسنت انہیں بچا نہ پایا اور نہ ہی کوئی جیوتشی، رمال یا منجم اپنے علم سے یہ نہ بتا سکا کہ جلد ہی ملک تقسیم ہوکر بھارت اور پاکستان دو ملکوں میں بٹ جائے گا اور ہزاروں معصوم بے گناہ افراد موت کے گھاٹ اُتار دیئے جائیں گے تو میرا اعتقاد جیوتشیوں' پیروں فقیروں' سادھوسنتوں ولیوں اور دیگر کرامات و معجزے دکھانے والے' پاکھنڈیوں' سے اُٹھ گیا۔ اسی دوران کانگریس سے بھی جس سے میری آزادی کے دوران عقیدت رہی تھی' دوری شروع ہوگئی اور میں کمیونسٹ پارٹی کے قریب آنے لگا اور اس میں میرے عزیز دوست اور اُردو اور ہندی کے ممتاز نقاد اور افسانہ نگار دیویندر اِسر صاحب کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو مَیں لڑکپن میں ہی ان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اور ہم دونوں نے شاہراہِ زندگی پر بہت طویل سفر ایک ساتھ طے کیا ہے۔

کانپور میں ہم دونوں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے ''نیو ایج'' اور''

www.taemeernews.com

محاذ'' کو بھی کچھ ساتھیوں تک پہنچانے کا کام سونپا گیا تھا اور جب بھی وہ اخبارات موصول ہوتے تھے میں انہیں تقسیم کرنے کے لئے سائیکل پر سوار ہوکر کانپور کے علاقے چمن گنج، مول گنج وغیرہ کی طرف نکل جاتا۔ زیادہ تر کام ہم دونوں مل کر ہی کرتے تھے۔ ایک بار ہمیں ہدایت ملی کہ آج رات کو نو بجے کے قریب ایک انڈر گراؤنڈ کامریڈ کو حلیم مسلم کالج سے کسی مخصوص جگہ پہنچانا ہے۔ لہذا دن میں ہمیں ایک شخص نے جا کر وہ چھوٹا سا مکان دکھایا جہاں اُس روپوش کامریڈ کو پہنچانا تھا۔ پھر رات کو ہم دونوں حلیم مسلم کالج پہنچے اور وہاں سے ہم نے ایک اسٹوڈنٹ کے پاس قیام پذیر اُس کامریڈ کو اپنے ساتھ لیا جو عجیب وغریب شکل وصورت کا لمبا تڑنگا نوجوان تھا، جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ کئی دن سے نہایا نہیں۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور اداسی کے آثار نمایاں تھے۔ کالج سے باہر سڑک پر آکر ہم تینوں ایک سائیکل رکشا پر تنگ وتاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے اُس مکان پر پہنچے اور اُس نوجوان کو وہاں پہنچا کر گھر واپس آ گئے۔ اُس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ پریشان حال نوجوان کون ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان کامریڈ مونس رضا تھے جو بعد میں کچھ عرصہ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم اور ہجرت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ تقسیم سے پہلے مارچ ۱۹۴۷ء میں راولپنڈی میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں بے شمار لوگ موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے اور عورتوں نے اپنی عصمت وعفت کو بچانے کے لئے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی جانیں قربان کیں۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا قصور تھا؟۔ یہی نا کہ وہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہندو تھے سکھ تھے مسلمان نہیں تھے؟ اور پھر آزادی کے دوران مَیں نے مشرقی پنجاب میں بھی بے گناہ مسلمانوں کو بھی جگہ جگہ قتل ہوتے ہوئے دیکھا اور مَیں سوچتا کیا

www.taemeernews.com

مسلمان ہونا گناہ ہے؟ اگست ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے مَیں میٹرک کا امتحان دینے مَیں دہرہ دون سے انبالہ آیا ہوا تھا اور جب مَیں واپس دہرہ دون جا رہا تھا تو مَیں نے دیکھا انبالہ ریلوے پلیٹ فارم پر بلوائی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو تہہ تیغ کر رہے ہیں اور اس وقت مذہبی جنون اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ کوئی انہیں بچانے والا بھی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ برِصغیر میں قتل عام کا ایسا تانڈو ناچ ہو رہا تھا لوگ وحشی پن اور جنون کی انتہا تک پہنچ چکے تھے اور سبھی انسان کی بجائے صرف ہندو، مسلمان یا سکھ بن کر رہ گئے تھے۔ اور شاید اگر انسان باقی تھا تو اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کسی نہتے کو بلوائیوں کے ہاتھ سے بچانے کی ہمت کر سکتا۔

مجھے یاد ہے کہ جب مَیں اور میرا ساتھی امتحان سے فارغ ہو کر بذریعۂ ریل گاڑی انبالہ سے سہارنپور کی طرف جا رہے تھے تو کچھ بلوائیوں نے ہمیں بھی مسلمان سمجھ کر گھیر لیا کیونکہ میرے لمبے تڑنگے ساتھی نے جو صوبہ سرحد کے شہر بنوں کا رہنے والا تھا، پٹھانوں کی طرح شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور شکل وصورت سے بھی وہ ہندو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انہوں نے اس کی شلوار تک اُتار کر تسلی کی اور مَیں اپنے ہاتھ پر کھدے ''اوم'' کو دکھا کر انہیں اطمینان دلانے میں کامیاب ہوا۔ پھر جب ان کی تسلی ہو گئی تو وہ دیگر لوگوں میں سے مسلمان تلاش کرنے لگے۔ اسی اثنا انہیں ایک داڑھی والا کمزور سا پھٹے حال شخص نظر آ گیا جو معلوم نہیں کب سے بھوکا پیاسا تھا۔ بلوائی اسے کھینچ کر گاڑی کے دروازے تک لے گئے۔ وہ منت سماجت کرتا رہا۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو، مگر کسی نے اُس پر رحم نہیں کھایا اور اس پر تلوار کے دو تین وار کرنے کے بعد اس چیختے چلاتے شخص کو چلتی گاڑی سے نیچے باہر پھینک دیا۔ لیکن اُس کی چیخیں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اور مَیں سوچتا ہوں اگر وہ لوگ ہم دونوں پر بھی یقین نہ کرتے تو اس دن ہمارا بھی وہی حشر ہوا ہوتا کیونکہ اس وقت لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ وہ ان بلوائیوں کو روکنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے

www.taemeernews.com

تھے۔ بھلا پاگل اور بپھرے ہوئے ہجوم کے سامنے کس کی چلتی ہے؟

میری ادبی زندگی کی ابتدا ساتویں آٹھویں جماعت میں تک بندی سے ہوئی اور مَیں پڑھی ہوئی نظموں غزلوں کی نقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اور پہلا افسانہ نویں دسویں میں ہفتہ وار 'چترا' لاہور کو بھیجا تھا جب مَیں گرمیوں کی تعطیلات میں اپنی پھوپھی کے ہاں پشاور گیا ہوا تھا۔ مگر معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا؟ ہاں تقسیم کے فوراً بعد میں نے ایک افسانہ ''ادیب'' لکھا تھا جو ماہنامہ ''نرالا'' نئی دہلی میں شائع ہوا تھا۔ ان ہی دنوں میری کچھ غزلیں اور نظمیں بھی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی تھیں مگر بعد ازاں مَیں نے شاعری کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ مجھ میں بحور و اوزان کی کچھ زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی۔

۱۹۴۹ء میں مَیں نے اور دیویندر اِسر نے مشہور صحافی اور شاعر میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ ''قومی اخبار'' اور ''امرت'' میں تھوڑی مدت کام کیا اور اس دوران ہم دونوں نے ترقی پسند رسالہ ''ارتقا'' بھی نکالا لیکن اس کا ایک ہی شمارہ نکل سکا کیونکہ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو دیویندر اسر گرفتار کر لئے گئے اور پھر رہائی کے بعد وہ کانپور سے دہلی آ گئے۔

اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں مَیں نے کانپور ہی سے ایک ماہنامہ ''نئی کہانی'' شروع کیا جس میں ہندی کے رسائل ''مایا'' اور ''منوہر کہانیاں'' کی طرح صرف کہانیاں ہی شائع ہوتی تھیں مگر دو شماروں کے بعد احساس ہوا کہ اُردو میں غزلوں نظموں کے بغیر کوئی رسالہ چلانا کارِ دشوار ہے لہذا اس میں منظوم حصہ بھی شامل کر دیا گیا مگر اس کے باوجود اس کے چار پانچ شمارے ہی نکل سکے اور اس کے بعد اس کا حشر بھی وہی ہوا جو عام طور پر رسائل کا ہوتا ہے۔ رسالہ بند ہو گیا اور اس کی بچی ہوئی کاپیاں مَیں سائیکل پر لاد کر کباڑی کی دکان پر بیچ آیا۔

مذکورہ بالا واقعہ کے کوئی تیس سال بعد جب مَیں پریس انفارمیشن بیورو میں

www.taemeernews.com

تھا تو پھر ایک اُردو رسالہ نکالنے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ لیکن اس بار مَیں چاہتا تھا کہ مَیں جو رسالہ نکالوں وہ دوسروں سے منفرد ہو۔ ورنہ رسالہ نکالنے میں کیا ہے؟ چند کہانیاں، مضامین اور ڈیڑھ دو درجن نظمیں اکٹھی کیجیے اور رسالہ تیار ہو گیا۔ دوسرے میں چاہتا تھا کہ اگر اس بار رسالہ نکالوں تو اسے کبھی بند نہ ہونا پڑے اور جب تک جسم اور دماغ ساتھ دیں اسے بغیر کسی کی مالی مدد کے نکالتا رہوں۔ اُن دنوں پبلی کیشن ڈویژن سے انگریزی میں ایک سالانہ حوالہ جاتی کتاب ''INDIA'' شائع ہوا کرتی تھی جو اب بھارت کے نام سے ہندی اور اُردو میں بھی شائع ہونے لگی ہے۔ مَیں چاہتا تھا کہ اس طرح کی حوالہ جاتی کتاب ''اُردو ادب'' سے متعلق شائع کروں۔ بہت غور و خوض کے بعد ۱۹۸۱ء میں مَیں نے ''اُردو ۱۹۸۲ء'' نام سے یہ حوالہ جاتی مجلّہ شائع کیا مگر جب اگلے شمارے کے لئے پریس رجسٹرار کے دفتر میں ''اُردو'' کے نام سے ڈیکلیریشن لینے گیا تو معلوم ہوا کہ اس نام سے کسی شخص نے حیدرآباد سے پہلے ہی ڈیکلیریشن لیا ہوا ہے۔ لہٰذا مجبوراً مجھے ''عالمی اُردو ادب'' کے نام پر اکتفا کرنا پڑا۔ اور اب ۱۹۸۵ء سے ہر طرح کی دقتوں کے باوجود میں اسے گزشتہ پچیس چھبیس سال سے نکال رہا ہوں اور اس کے ۳۲ شمارے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اب تک عام حوالہ جاتی شماروں کے علاوہ اس کے آٹھ خصوصی شمارے حبیب جالب، دیویندر اسر، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، اشفاق احمد، گوپی چند نارنگ، کشمیری لال ذاکر اور محمد حسن کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

اور..... جہاں تک اس جریدے کی دیگر رسائل سے انفرادیت کی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ اُردو کا واحد حوالہ جاتی رسالہ ہے جس میں گزشتہ سال کی اہم ادبی کارروائیوں اور واقعات و سانحات کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں عام اُردو رسائل کی طرح کبھی بھی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، مومنؔ وغیرہ پر مضمون شائع نہیں کئے جاتے بلکہ اس

www.taemeernews.com

میں سال گزشتہ میں وفات پانے والے ادباء وشعراء کے بارے میں گوشے اور مضامین شائع کیے جاتے ہیں اور ساتھ ہی سال مذکور میں شائع ہونے والی کچھ اہم کہانیاں اور نظمیں غزلیں نیز تحقیقی اور معلوماتی مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ یہی نہیں عام رسائل کے برخلاف اسے مجلد کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے تاکہ عام رسائل کی طرح پڑھ کر اسے ردی کی نذر نہ کر دیا جائے بلکہ دیگر کتابوں کی طرح اسے لائبریریوں اور گھروں کے شیلف میں محفوظ رکھا جا سکے۔ غالباً اُردو کا یہ واحد جریدہ ہے جس میں ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو حروف تہجی کے لحاظ سے شائع کیا جاتا ہے تاکہ کسی کو تخصیص وامتیاز کی شکایت نہ ہو۔ نیز اس رسالے میں سالانہ ممبر شپ یا لائف ممبر شپ کا کوئی التزام نہیں ہے جیسا کہ بعض رسائل سالانہ اور لائف ممبر شپ کے نام پر رقوم وصول کرتے ہیں لیکن وہ زندگی بھر تو کیا چند پرچے نکال کر ہی سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں اور قارئین کے پیسے ڈوب جاتے ہیں۔ ''عالمی اُردو ادب'' کا کوئی سالانہ یا لائف ممبر نہیں ہے کیونکہ یہ جریدہ ایک انفرادی کوشش سے شائع ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی معاون ہے نہ سرپرست۔ لہٰذا معلوم نہیں کہ اگلا شمارہ شائع ہو سکے گا کہ نہیں۔

کانپور سے دہلی آنے کے بعد مارچ ۱۹۵۷ء میں مَیں دہلی ایڈمسٹریشن میں ملازم ہو گیا اور دو سال بعد محکمہ تعلقاتِ عامہ میں میرا بطور ایگزامینر کم ٹرانسلیٹر Examiner-cum-Translator تقرر ہو گیا جہاں مشہور صحافی رام لال ورما ڈائرکٹر اور معروف نقاد راجندر ناتھ شیدا اسٹیٹ پریس آفیسر تھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۴ سے ۱۹۷۹ء تک میں بطور سب ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر ماہنامہ ''آج کل'' سے منسلک رہا۔ مگر یہاں یہ ملازمت مجھے اتفاق ہی سے ملی تھی کیونکہ اُس وقت کے ایڈیٹر عرش ملسیانی صاحب ایک امیدوار ہربنس لال نارنگ کو اس پوسٹ کے لئے لینے کا ارادہ کئے ہوئے تھے جو اکثر ان کے ہاں آیا جایا کرتا تھا مگر ڈپٹی ڈائرکٹر شنکر دیال ایک خاتون زہرہ سکینہ کو لینے کے حق میں تھے جو کہ ''آج کل'' میں ہی بطور

www.taemeernews.com

ٹائپسٹ کام کرتی تھی اور جس کا شوہر سکسینہ بھی وہاں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور بڑا رسوخ رکھتا تھا۔ جب سکسینہ کو معلوم ہوا کہ عرش صاحب ہربنس لال نارنگ کو اس پوسٹ کے لئے لینا چاہتے ہیں تو اُس نے اُس کی درخواست کہیں خرد برد کردی لہذا جب عرش صاحب نے امیدوار چھانٹنے کے لئے پرسنل ڈیپارٹمنٹ سے درخواستیں طلب کیں تو اس میں نارنگ کی درخواست غائب تھی۔ تب انہوں نے نار نگ سے دوبارہ درخواست لے کر فہرست میں شامل کر لی۔ پھر جب ٹیسٹ ہوا تو اس میں ہربنس لال نارنگ اول تھا اور مَیں دوم۔ اس کے بعد چار پانچ امیدواروں کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ عرش صاحب کی مرضی نارنگ کو لینے کی تھی مگر ڈائرکٹر نے اسے اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ اس کی درخواست وقت پر دفتر نہیں پہنچی تھی اور وہ دفتر میں ڈائری بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر ڈائرکٹر صاحب نے زہرہ سکسینہ کو لینے کا ارادہ ظاہر کیا جسے عرش صاحب نے ماننے سے انکار کر دیا اور نارنگ اور مسز سکسینہ کو لینے پر افسروں میں اتفاق نہ ہونے کے کارن میرا تقرر کر دیا گیا۔ جہاں مَیں لگ بھگ پندرہ سال تک کام کرتا رہا۔

۱۹۶۴ء میں مَیں نے ''آج کل'' میں ملازمت جوائن کی۔ اس وقت مدیر عرش ملسیانی صاحب تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر شہباز حسین صاحب۔ بعد ازاں جب عرش صاحب سبکدوش ہو گئے تو شہباز صاحب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کچھ مدت بعد جب اُن کا تقرر اُردو بیورو میں بحیثیت پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ہو گیا تو مہدی عباس حسینی اس عہدے پر مقرر ہوئے۔ ان دونوں حضرات کے ساتھ کام کرنے کے دوران کی کئی خوشگوار یادیں آج بھی فراموش نہیں ہوئیں اور ان دونوں کے ساتھ میرے دفتری ہی نہیں بلکہ ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ حسینی صاحب کی سبکدوشی کے چند برس بعد دورۂ قلب سے وفات ہونے پر ایسے افسوس ہوا تھا جیسے میرا بڑا بھائی مجھ سے رخصت ہو گیا ہو۔ اور سچ مچ وہ بھی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتے تھے اور یہ تعلقات

www.taemeernews.com

ان کے کنبے کے ممبروں کے ساتھ آج بھی اسی طرح استوار ہیں۔شہباز صاحب کے ساتھ مَیں نے دفتر میں سب سے زیادہ عرصہ گزارا ہے اوران کے ساتھ میری بہت ہی قربت رہی ہے۔اب ہم عمر کے اس پڑاؤ پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے نہیں مل پاتے مگرفون پر ہفتے دو ہفتے میں بات چیت ضرور ہو جاتی ہے۔

'آج کل' میں ملازمت کے دوران مجھے بہت سی بڑی بڑی ادبی شخصیات کو دیکھنے اوران سے بات چیت کرنے کا شرف حاصل ہوا جن میں پروفیسر کلیم الدین احمد، فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ ملسیانی، جگرؔ مرادآبادی، جمیلؔ مظہری، سلامؔ مچھلی شہری، دیویندر ستیارتھی، بسملؔ سعیدی، گوپال متل، تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزاد، علی جواد زیدی اور ساغرؔ نظامی ایسی نامور ہستیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔موخر الذکر ساغرؔ نظامی صاحب تو آل انڈیا ریڈیو سے سبکدوشی کے بعد چند برس تک ہمارے دفتر پبلی کیشنز ڈویژن میں بطور اوایس ڈی (Officer on Special Duty) بھی خدمات انجام دیتے رہے اوراس دوران اُن کے ذمے جنگ آزادی کی منظوم تاریخ لکھنا تھا۔خوش قسمتی سے اُن کا کمرہ ہمارے کمرے سے ملحق تھا لہذا اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے، لنچ کرنے، انڈیا گیٹ کے لان میں سیر کرنے اور گپ شپ کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

میری گزشتہ چھپن ستاون سال سے صحافت سے بھی وابستگی رہی ہے اور مَیں نے انگریزی' ہندی' پنجابی میں متعدد مضامین اور لگ بھگ تیس کے قریب کتابیں ترجمہ کی ہیں۔اور اُردو میں زیادہ تر کتابیں مَیں نے خود ہی چھاپی ہیں کیونکہ اُردو میں کتابوں کی اشاعت کے لئے ناشر آسانی سے نہیں ملتے اور جو ملتے ہیں وہ اکثر ادبا و شعراء سے معاوضے دینے کے بجائے کتاب کی اشاعت کے لئے رقم لے کر یہ ''خدمت'' انجام دیتے ہیں۔اور پھر مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ناشرین کے دربار میں حاضر ہو کر کتاب کی اشاعت کے لئے گڑگڑاتا یا انہیں اپنے پلے سے پیسے دے

www.taemeernews.com

کر کتاب چھپواتا۔اور جہاں تک ہندی کا سوال ہے میری کتابیں دو تین ناشر چھاپتے ہیں اور اس کے لئے معاوضہ بھی دیتے ہیں۔۔شاید آپ کو معلوم نہیں میں نے اپنا ناول ''یادوں کے کھنڈر'' ۱۹۵۴ء کے قریب اُردو میں لکھا تھا مگر اس کے لئے اُردو کا کوئی ناشر نہیں ملا تھا۔پھر ۱۹۶۰ء کے قریب اسے نو یگ پرکاشن نے ہندی میں شائع کیا اور پھر بیس سال بعد ۱۹۸۰ء میں مَیں نے خود اسے اُردو میں شائع کیا۔

'میرا کبھی کسی گروپ سے تعلق نہیں رہا اور نہ ہی مَیں نے اپنی کتاب پر کسی نقاد یا ادیب سے کبھی کوئی دیباچہ لکھوایا ہے۔اور نہ ہی کسی بڑے نقاد یا ادیب سے کبھی اپنے یا اپنی کتابوں کے بارے میں لکھنے کی گزارش کی ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ نقادوں کے دیباچے سے قاری کو مرعوب کرنے کے بجائے اُسے کتاب پڑھ کر خود فیصلہ کرنے دیجیے، پہلے سے ہی نقاد کی رائے مت تھوپیے کہ کتاب کیسی ہے؟ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک کسی بڑے ادیب یا نقاد نے میرے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ہاں کچھ ممتاز اور معروف نقادوں اور ادیبوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی تحریری رائے سے نوازا ہے جس کے لئے مَیں ان کا شکر گزار ہوں۔

زیادہ تر لوگ اپنی والدہ سے متاثر ہوتے ہیں مگر مَیں والدہ کے بجائے اپنی نانی سے متاثر ہوا ہوں جنہوں نے میری والدہ کی وفات کے بعد میری پرورش و پرداخت کی اور جن کے ساتھ مَیں شادی ہونے کے بعد بھی ایک سال تک رہا اور اس کے بعد اپنا ذاتی مکان تعمیر کر کے اُن ہی کے قریب کرشن نگر میں رہنے لگا۔

میری شادی ۱۱ر مئی ۱۹۶۱ء کو کرشن نگر دہلی میں ہوئی تھی جس کے بدولت مجھے ایک بیٹے (وکاس دت) اور دو بیٹیوں (رتو ملہوترا اور جوہی بالی) پر مشتمل ایک چھوٹا سا پریوار نصیب ہوا۔بیٹا گزشتہ تین دہوں سے امریکہ میں نیو جرسی (نیو یارک کے قریب) میں رہ رہا ہے۔اور میری بیٹیاں شادی کے بعد اپنے اپنے پریواروں کے ساتھ دہلی میں بڑے آرام و آسائش سے زندگی گزار رہی ہیں۔اور اب گھر میں صرف

www.taemeernews.com

ہم دونوں میاں بیوی ہی زندگی گزار رہے ہیں۔میری بیوی آشادت بہت ہی مہمان نواز اور ملنسار خاتون ہے اور وہ گھر میں آنے والے ہر شخص کا بڑی گرم جوشی سے سواگت کرتی ہے جس کے کارن جو بھی کوئی اس کے رابطے میں آتا ہے،اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ گزشتہ اکیاون باون سال سے میرے دکھ سُکھ میں میری شریک رہی ہے۔اوراب ہم عمر کی اس دہلیز پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت اپنے رفیقِ حیات کا ساتھ چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہوسکتا ہے اور پھر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی تنہائی کے درد کو سہنا پڑے گا۔ بقول میری اہلیہ کے ''زندگی کی اس دوڑ میں اپنے آخری پڑاؤ پر پہنچنے کے لئے ہم دونوں میں ریس (Race) لگی ہوئی ہے،معلوم نہیں اس میں کون جیتے گا؟ تاہم میری خواہش ہے کہ اس میں میری جیت ہو۔''

جہاں تک مذہب کا سوال ہے میں ہندو دھرم میں پیدا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو آفاقی مذہب ''انسانیت' کا پیروکار مانتا ہوں۔مَیں فطرت کا بہت بڑا پرستار ہوں اور نیچر کو ہی ایشور خدا سمجھتا ہوں۔میرا عقیدہ ہے کہ نیچر کے مظاہرات کو نہ سمجھ کر ہی پیروں،پیغمبروں،فقیروں،ولیوں،سادھو،سنتوں نے اسے خدا بھگوان گاڈ کے نام سے موسوم کر دیا۔لہذا میں کسی ایشور میں یقین نہیں رکھتا اور نیچر کو تعمیر وتخریب کا منبع سمجھتا ہوں۔نیز میں کسی سورگ یا نرک میں جانے کے عقیدے میں یقین نہیں رکھتا اور اسے مذہبی مفروضوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ میرا ماننا ہے کہ موت کے بعد انسانی جسم کے خاتمے کے ساتھ ہی سارا کھیل ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد باقی جنت ودوزخ کے قصے کہانیاں پنڈتوں مولویوں اور مذہبی رہنماؤں کے اختراع کردہ ہیں ان میں کوئی اصلیت وصداقت نہیں۔

اسی لئے میری دلی خواہش رہی ہے کہ میری موت کے بعد پنڈتوں اور پروہتوں کو بلا کر بیکار کی مذہبی رسمیں نہ ادا کی جائیں اور میرے جسدِ خاکی کو جلا کر ضائع

www.taemeernews.com

کرنے کے بجائے اسے طبی مقاصد کے لئے بطور عطیہ دے دیا جائے تاکہ جسم کے کچھ اعضاء جیسے آنکھیں، گردے، جگر اور جلد وغیرہ میری موت کے بعد فوراً نکال کر کسی ضرورت مند مریض کو شفایاب کرنے کے لئے بروئے کار لائے جاسکیں اور جسم کا جو بقیہ حصہ کسی کام کا نہ ہو اسے سماج جس طرح بھی بہتر سمجھے.....نذرِ آتش کر کے، نذرِ آب کر کے یا سپردِ خاک کر کے، ٹھکانے لگا دے، یہ اس کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بقول آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر:

مردے کو دفن کیجیے یا پھینک دیجیے
مردہ بدست زندہ ہے جو چاہے کیجیے

☆☆☆

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اختتامیہ

اپنی رفیقۂ حیات

آشا دت

کے نام

جو ۵۲ سال تک

زندگی کے ہر نشیب و فراز میں

ساتھ نبھانے کے بعد

۴/اپریل ۲۰۱۳ء

کو

داغِ مفارقت دے گئی

نند کشور وکرم

کُچھ دیکھے کُچھ سُنے

نند کشور وکرم